عشق ایک چڑیل کا

جرم و سراغرسانی کی چار سچی کہانیوں کا مجموعہ

محبوب عالم

عشق ایک چڑیل کا

محبوب عالم
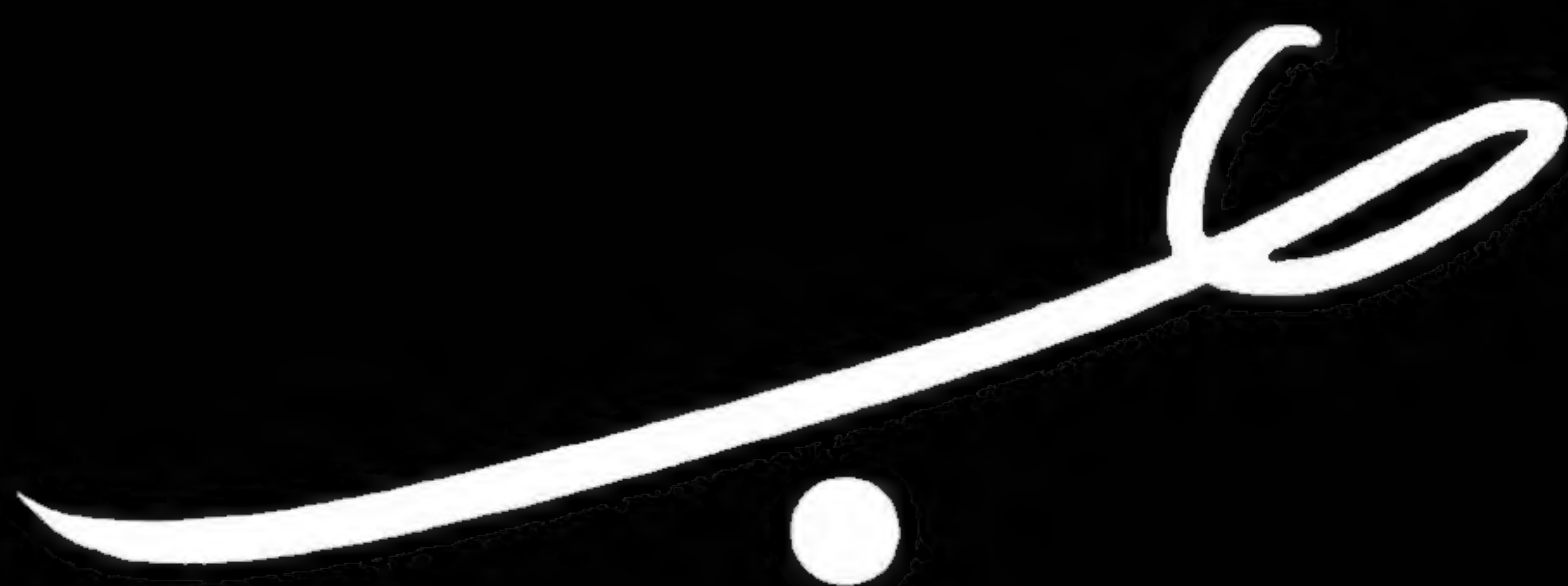
فہرست

ریشمی رومال اور دل میں تیر

وہ چھوٹا سا ایک شہر تھا جس کو قصبہ کہا جائے تو بھی ٹھیک ہے اور دیہاتی شہر کہا جائے تو زیادہ ٹھیک ہے۔ یہ میں اس واسطے کہہ رہا ہوں کہ یہ بہت بڑی منڈی تھی۔ غلہ اور دالیں اور سرسوں کا تیل اس علاقے کی پیداوار تھی۔ اس بنا پر ہندو تجارت کرتے اور مسلمان زراعت پیشہ تھے۔ کچھ مسلمان ملازمت پیشہ بھی تھے اور بعض چھوٹی موٹی دکانداری بھی کرتے تھے۔ زراعت پیشہ مسلمانوں میں بعض اچھے خاصے امیر تھے اور وہ سب کے سب خود کاشت کاری نہیں کرتے تھے۔ بعض نے زمینیں بٹائی پر دی ہوئی تھیں اور بعض نے مزارعے رکھے ہوئے تھے۔ منڈی میں غلہ وغیرہ انہی کا آتا تھا۔ اس طرح یہ مسلمان شہری بھی تھے اور دیہاتی بھی، یا ان کو پڑھے لکھے دیہاتی کہہ لیں۔

میں اس شہر کے تھانے کا انچارج تھا۔ وہاں یہی ایک تھانہ تھا۔ شہر کے اردگرد پانچ پانچ میل کے علاقے میں آنے والے دیہات میرے تھانے کے تحت تھے۔ ایک روز شام کے تقریباً چار بجے اس شہر کے اُس حصے کا نمبردار جو مسلمانوں کی آبادی کا حصہ تھا، تھانے میں آیا۔ اُس کے ساتھ ایک سفید پوش اور ایک اور آدمی تھا۔ یہ جو آدمی تھا اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اِن تینوں کے ساتھ میرا ایک ہیڈ کانسٹیبل بھی تھا۔

وقوعہ یہ ہوا تھا کہ اس آدمی کا بھائی گھوڑی سے گر کر مر گیا تھا۔ گھوڑی سے گر کر مرنے کی رپورٹ تھانے میں دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ اصل میں موت اس طرح واقع ہوئی تھی کہ یہ شخص گھوڑی پر کہیں سے واپس آ رہا تھا۔ راستے میں گھوڑی بدک گئی اور منہ زور ہو کر دوڑ پڑی۔

سوار گر پڑا لیکن اُس کا ایک پاؤں رکاب میں پھنس گیا اور گھوڑی اُس کو گھسیٹتی رہی۔ گھوڑی کی زین ڈھیلی ہو کر اُس طرف ہو گئی تھی جس طرف سوار گرا تھا۔

اس طرح کسی کے مرنے کی بھی رپورٹ تھانے میں دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایسا حادثہ کبھی کبھی ہو جاتا تھا کہ دوڑتے گھوڑے سے سوار گرا تو ایک پاؤں رکاب سے آگے ہو کر پھنس گیا اور گھوڑے نے اُس کو گھسیٹ گھسیٹ کر مار دیا۔ ایک بار میں نے یہ واقعہ بھی دیکھا تھا کہ تیرہ چودہ سال عمر کا ایک لڑکا کھیتوں میں بھینس چرا رہا تھا۔ اُس نے بھینس کی رسّی پکڑی ہوئی تھی۔ وہ نادان لڑکا تھا۔ اُس نے رسّی کا سرا اپنی کلائی کے ساتھ باندھ لیا۔ ایک کتا بھینس کے قریب سے گزرا تو بھینس پر بھونکا۔ بھینس ڈر کر دوڑ پڑی۔ لڑکا تھوڑی دور تک اُس کے ساتھ دوڑتا رہا پھر وہ گر پڑا اور بھینس اُس کو گھسیٹتی رہی۔ لڑکے کی زندگی کچھ اور بھی ہوئی تھی۔ آگے سے دو تین آدمی آ رہے تھے۔ انہوں نے بھینس کو روک لیا۔ لڑکا زندہ تو رہ گیا لیکن اُس کو تین دنوں کے بعد ہوش آئی تھی۔ اُس کی کھال چھیلی گئی تھی اور چہرے پر ایسے زخم آئے تھے کہ ان کے نشانات نے چہرے کو خراب کر دیا تھا۔

یہ جو سوار گھوڑی سے گر کر مر گیا تھا، اس کے گرنے کی وجہ یہ بھی تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی زین ڈھیلی ہو کر ایک طرف سرک گئی تھی۔ ان لوگوں نے تھانے نہیں آنا تھا۔ اِن کے آنے کا سبب یہ بنا کہ گھوڑی شہر کے تقریباً آدھا میل قریب آئی تو کچھ آدمیوں نے اس کو روک لیا۔ سوار کو وہ پہچانتے تھے۔ وہ مر گیا تھا۔ اُس کا پاؤں رکاب سے نکال دیا اور لاش کو اور گھوڑی کو وہیں رہنے دیا۔

سوار کے گھر اطلاع پہنچی تو اُس کے رشتہ دار وہاں گئے۔ وہ لاش کو اُٹھا کر لے جاتے اور پھر کفن دفن کر دیتے لیکن میرا یہ ہیڈ کانسٹیبل جو ان تینوں کے ساتھ آیا تھا، تھانے کے ایک کام سے ایک گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ وہ اُدھر سے واپس آ رہا تھا۔ اُس نے لوگوں کا مجمع دیکھا تو وہاں چلا گیا۔

اُس نے لاش کو دیکھا اور حادثے کا ماجرا سُنا۔

اُن وقتوں میں پولیس کا ہر فرد اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل تو افسری میں شمار ہوتا تھا۔ آج کل بھی ہیڈ کانسٹیبل کی سرکاری پوزیشن وہی ہے جو انگریزوں کے وقتوں میں ہوتی تھی مگر انگریزوں کے وقتوں میں یہ نہیں ہوتا تھا کہ کوئی واقعہ یا حادثہ ہو جاتا تو پولیس والے پہلے یہ دیکھتے کہ کون سا چکر چلا کر اس وقوعہ سے لاتعلق ہو سکتے ہیں اور اگر یہ گلے پڑ ہی جائے تو اس سے چار پیسے کس طرح کما سکتے ہیں۔

میرے کانسٹیبل نے یہ تصدیق کرنے کے واسطے کہ سوار کی موت اسی طرح واقع ہوئی ہے جس طرح یہ لوگ بیان کرتے ہیں، لاش کو اچھی طرح دیکھا۔ پھر اُس نے زین کا معائنہ کیا۔ اس کے ڈھیلا ہونے کا کیا سبب بنا۔ اُس نے سوار کے رشتہ داروں کو یہ حکم دیا کہ لاش کو ادھر ہی پڑا رہنے دیں اور گھوڑی جہاں کھڑی ہے اس کو اِدھر ہی کھڑا رہنے دیں اور اس کی زین جس پوزیشن میں ہے یہ اسی پوزیشن میں رہے۔ اُس نے وہاں اپنی جان پہچان کے تین چار آدمیوں کو پہرے پر کھڑا کر دیا اور ان تین آدمیوں کو اپنے ساتھ تھانے لے آیا۔

جب سوار کا بڑا بھائی مجھ کو رپورٹ دے چکا تو اُس نے مجھ سے اجازت مانگی کہ وہ لاش اُٹھا لے۔

"میرے بھائی کی اسی طرح لکھی ہُوئی تھی" ــــ اُس نے روتے ہوئے کہا ــــ "وہ تو بڑا پکا سوار تھا لیکن اُس نے اسی طرح مرنا تھا۔ زین کا تنگ ڈھیلا ہو گیا اور وہ گر پڑا۔ شاید اُس کے گرنے سے گھوڑی مڑ کر دوڑ پڑی ہو گی۔"

"پکے سوار کا تنگ ڈھیلا نہیں ہو سکتا" ــــ میرے ہیڈ کانسٹیبل نے کہا ــــ "اور گھوڑا منہ زور اور بے لگام ہو جائے تو پکا سوار پہلا کام یہ کرتا ہے کہ پاؤں رکابوں میں ذرا پیچھے کر لیتا ہے کہ آگے سرک کر پاؤں رکاب میں پھنس نہ جائے" ــــ ہیڈ کانسٹیبل نے مجھ کو کہا ــــ "جناب! معاملہ پختہ شک والا ہے۔ مجھ کو یہ وقوعہ قتل کا معلوم ہوتا ہے.... جناب غور

کمربں۔ لاش کے گلے میں ریشمی رومال رسّی کی طرح مروڑا ہُوا پڑا ہے۔ گردن کے پیچھے ایک گانٹھ ہے اور زین کا تنگ تقریباً نصف چوڑائی میں چاقو یا چھری سے کاٹا ہوا ہے.... جناب خود جائے وقوعہ کا معائنہ کریں۔ بندہ کو شاید غلطی لگی ہو۔ یہ وقوعہ دفعہ ۳۰۲ (قتل) کا معلوم ہوتا ہے۔"

میں اس ہیڈ کانسٹیبل (حوالدار مُرشد علی) اور تین کانسٹیبلوں کی ہمراہی میں وہاں گیا جہاں لاش پڑی ہُوئی تھی۔ لوگوں نے اوپر چادر ڈالی ہُوئی تھی۔ ہیڈ کانسٹیبل نے چادر ہٹائی۔ مَیں نے سب سے پہلے لاش کی گردن دیکھی۔ گردن کے گرد ریشمی رومال رسّی کی طرح بندھا ہُوا تھا۔ گردن کے پیچھے ایک ہی گانٹھ تھی۔ مَیں نے رومال کھولا تو مجھ کو پتہ لگا کہ رومال جو ریشم کی رسّی بنا ہُوا تھا گردن میں اُتر گیا تھا اور اس کے نیچے جو خون جما ہُوا تھا وہ نیلے رنگ کی لکیر بن گیا تھا۔ مقتول کا رنگ صاف گندمی تھا۔ مگر یہ رنگ کچھ سفید ہو گیا تھا۔

ہیڈ کانسٹیبل مُرشد علی نے ٹھیک کہا تھا۔ یہ قتل کی واردات تھی۔ مَیں نے گھوڑی کا تنگ بھی دیکھا۔ وہ آدھی چوڑائی میں کٹا ہُوا تھا۔ تنگ کٹا ہُوا نہ بھی ہوتا تو بھی لاش کی گردن بتا رہی تھی کہ یہ قتل کی واردات ہے۔ مقتول کے سر اور جسم کی حالت بہت بُری تھی۔ کپڑے پھٹ گئے تھے اور کھال چھیلی ہُوئی تھی۔ چہرے پر بھی زخم تھے۔ مَیں نے مقتول کے بڑے بھائی کو کہا کہ چارپائی کا بندوبست کرے۔ لاش پوسٹ مارٹم کے واسطے بھیجنی تھی۔ آپ آج کل بھی دیکھ رہے ہوں گے کہ کوئی شخص کسی حادثے میں فوت ہو جائے اور ڈاکٹر پوسٹ مارٹم کی ضرورت محسوس کرے تو مرنے والے کے رشتہ دار پولیس کو اور ڈاکٹر کو اس کام کی رشوت پیش کرتے ہیں کہ پوسٹ مارٹم نہ ہو۔ اسے وہ مرحوم کی توہین سمجھتے ہیں۔ یہ دراصل اُن کا اپنا جذباتی معاملہ ہوتا ہے۔

ایسا ہی اس شخص کے رشتہ داروں نے کیا جو گھوڑی سے گر کر مر گیا تھا۔ پہلے اس کے بھائی نے کہا کہ لاش کا پوسٹ مارٹم نہ کیا جائے۔ مَیں

نے اُس کو کہا کہ یہ صاف قتل کا کیس ہے، اس وجہ سے میں لاش کو رشتہ داروں کے حوالے نہیں کر سکتا۔

"بے چارا پہلے ہی تکلیف سے مرا ہے" ـــــ اُس نے کہا ـــ "میری کوئی غرض یا رپورٹ نہیں۔"

"ایک بات بتائیں چوہدری صاحب!" ـــ میں نے اُس سے پوچھا۔ "کیا یہ اپنے گلے میں ریشمی رومال رسی بنا کر باندھا کرتا تھا؟"

"اس نے تو ریشمی رومال گلے میں کبھی ڈالا ہی نہیں تھا" ـــ اُس نے جواب دیا۔

"اس نے نہیں ڈالا تھا تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ کوئی اور ڈال گیا ہے" ـــ میں نے کہا ـــ "ذرا عقل سے کام لیں اور میرے کام میں دخل نہ دیں۔"

ایک اچھا خوبرو نوجوان میرے قریب آیا اور مجھ کو سلام کیا۔ اُس کی عمر تیئس چوبیس سال تھی۔

"جناب ہم کوئی رپورٹ نہیں لکھوائیں گے" ـــ اُس نے کہا ـــ "یہ بہت عزت والے آدمی تھے۔ اُن کی میت خراب کر کے ہمارے دلوں کو بہت تکلیف ہوگی۔"

"کیا تم اس کے بیٹے ہو؟"

"نہیں جناب!" ـــ اُس نے جواب دیا ـــ "میں ان کا سالا ہوں۔"

"جناب سالا صاحب!" ـــ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ـــ "آپ کے بہنوئی گھوڑی سے گرنے اور رکاب میں پھنس جانے سے نہیں مرے انہیں مارا گیا ہے اور میں مارنے والوں کو نہ پکڑوں تو میں مجرم ہوں۔"

اُس نے بحث شروع کر دی۔ میں نے اُس کو ڈانٹ کر پرے کیا اور چارپائی آئی تو لاش پوسٹ مارٹم کے واسطے بھجوا دی۔ مقتول کا نام اسحاق تھا اور اُس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔

سب سے پہلے آپ کو ریشمی رومال کی بابت کچھ بتا دوں۔ اُن وقتوں میں خالص ریشم کے رومال ہوتے تھے جو لوگ زیادہ تر نوجوان اور جوان، اپنے پاس رکھتے تھے اور تحفے کے طور پر بھی دیے جاتے تھے۔ چھوٹے یعنی

عام سائز کے رومال جیب میں یا ہاتھ میں رکھے جاتے تھے اور ایک سائز بڑا بھی ہوتا تھا۔ یہ دو بالشت سے بھی ذرا زیادہ لمبا اور اتنا ہی چوڑا ہوتا تھا۔ ریشم اتنا خالص اور باریک کہ اتنے بڑے رومال کو مٹھی میں چھپایا جا سکتا تھا۔ شہروں کے لوگ بڑا رومال مفلر کے طور پر استعمال کرتے اور دیہات کے شوقین کندھے پر ڈال کر یا ویسے ہی گلے میں دونوں طرف لٹکا کر رکھتے تھے لیکن یہ رومال قیمتی ہونے کے باعث کسی کسی کے پاس ہوتا ہے۔

یہ رومال جو مقتول اسحاق کے گلے میں باندھا گیا تھا، پھولدار تھا پھول بڑے بڑے تھے اور یہ رومال بڑے سائز کا تھا۔ میں نے اس کو پھیلا کر بہت غور سے دیکھا۔ مجھ کو امید تھی کہ اس پر کسی کا نام لکھا ہوا ہو گا۔ نام تو کسی کا نہیں تھا۔ ایک نشانی مل گئی۔ یہ محبت کا مشہور نشان تھا —— پان کے پتے کی شکل کا دل بنا ہوا تھا اور اس میں سے ایک تیر گزرا ہوا تھا۔ یہ نشان کچی پنسل سے بنا ہوا تھا جس کے سکّے کو تھوک لگا کر لکھتے ہیں تو رنگدار لکھتی ہے۔

اس نشان سے مجھ کو دو اشارے ملے۔ ایک یہ کہ یہ رومال تحفے میں دیا گیا ہے اور دوسرا یہ کہ یہ تحفہ کسی عورت نے دیا ہے۔ رومال قاتل کا تھا۔ میں نے مقتول کے بھائی سے پوچھا تھا تو اس نے مجھ کو بتایا تھا کہ مقتول نے ایسا رومال کبھی اپنے پاس نہیں رکھا تھا۔

جن آدمیوں نے گھوڑی کو روکا تھا وہ وہاں موجود تھے۔ ان کی تعداد تین تھی۔ سورج ڈوبنے میں تھوڑا وقت رہ گیا تھا۔ میں نے یہ راستہ دیکھنا تھا جدھر سے گھوڑی آئی تھی۔ ان تین آدمیوں سے معلوم کیا تو انہوں نے بتایا کہ گھوڑی کدھر سے آ رہی تھی۔ وہ نہ بتلاتے تو بھی مجھ کو معلوم ہو جاتا۔ مقتول کے گھسٹنے کے نشان اور گھوڑی کے قدموں کے نشان صاف تھے۔ میں ان کو دیکھتا ہوا چل پڑا۔ راستے میں کچی زمین بھی آئی اور پکی بھی آئی اور اونچی نیچی جگہ بھی آئی۔ گھوڑی کھیتوں میں سے بھی گزری اور ریتلی جگہ سے بھی۔

ان نشانات کو دیکھتے دیکھتے میں ایک میل دور چلا گیا۔ وہاں نشان

ختم ہو گئے۔ یہ کسی کا چھوٹا سا کھیت تھا اور خالی تھا۔ اس میں کوئی فصل نہیں تھی۔ اس کی مٹی نرم تھی جس وجہ سے گھوڑی کے اور آدمیوں کے قدموں کے نشانات صاف تھے۔ کھوجی کو پیغام بھیجا ہوا تھا۔ وہ ابھی نہیں آیا تھا۔ میں نے خود ہی کھرے دیکھنے شروع کر دیے۔

یہ کھیت نشیب میں تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک گھاٹی تھی۔ یہ پگڈنڈی تھی جو گھاٹی سے اُترتی تھی۔ کھیت اور گھاٹی کے درمیان دیوار کی طرح لمبوترا ٹیلہ تھا جس کی وجہ سے کھیت سے پگڈنڈی نظر نہیں آتی تھی اور پگڈنڈی اور گھاٹی سے بھی کھیت نظر نہیں آتا تھا۔ یہ ٹیلہ گول دیوار کی طرح کھیت کے تین اطراف چلا گیا تھا۔ صرف ایک طرف نہیں تھا۔

اس کھیت میں جو کھرے تھے، مَیں نے ان کو دیکھا۔ یہ پگڈنڈی تک چلے گئے۔ ان سے مجھ کو پتہ لگا کہ گھوڑی کو پگڈنڈی سے ٹیلے کی اوٹ میں لایا گیا۔ دو آدمیوں کے کھرے کھیت میں گئے۔ ساتھ گھوڑی کے قدموں کے نشانات تھے۔ ٹیلے کی اوٹ میں گھوڑی رُکی۔ وہاں سے گز ڈیڑھ گز ہٹ کر آدمیوں کے قدموں کے گڈمڈ کھرے تھے اور مٹی بتاتی تھی کہ یہاں دھینگا مُشتی ہوئی ہے۔

پھر گھوڑی کے چلنے کے نشانات تھے اور اس کے ساتھ زمین پر رگڑ کا نشان تھا جو گھوڑی کے قدموں کے ساتھ چلا گیا۔ ان نشانات کو سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ مقتول کو گھوڑی سے اُتار کر ریشمی رومال سے اُس کا گلا گھونٹا گیا پھر اُس کا پاؤں رکاب میں پھنسا کر گھوڑی کو دوڑا دیا گیا۔ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ رومال مقتول کی گردن سے اُتارا کیوں نہیں گیا۔ میں اس پر بھی حیران ہوا کہ رومال کو صرف ایک گانٹھ دی گئی تھی مگر گھوڑی مقتول کو گھسیٹتی ہوئی اتنی دُور لے گئی اور رومال گلے کے ساتھ بندھا رہا۔

دو آدمیوں کے کھرے پگڈنڈی کی طرف نہیں گئے۔ یہ ایک اور طرف چلے گئے اور اس کھیت سے نکل کر اوپر چلے گئے۔ اوپر کھیتوں کی مینڈھیں تھیں اور گندم کی فصل بھی کھڑی تھی۔ مینڈھوں پر کھرا ڈھونڈنا

مشکل تھا۔ کھیت میں یہ دو کھرے اتنے صاف تھے کہ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو کہا کہ ان کے مولڈ تیار کرنے کا بندوبست کرے۔

وہ جگہ شہر سے سوا میل دُور تھی۔ میں وہاں سے آ گیا اور مقتول کے بڑے بھائی کی بیٹھک میں بغرضِ تفتیش بیٹھ گیا۔ مجھ کو بتایا گیا کہ گھوڑی کے پیچھے دُم سے ذرا دائیں طرف سے خون نکلا ہوا ہے اور وہاں چھوٹا سا زخم ہے۔ شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ میں نے لالٹین کی روشنی میں زخم دیکھا۔ خون جما ہوا تھا۔ گھوڑی وہاں ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھی۔ میں نے گھوڑی کو شہر کے سرکاری سلوتری (ویٹنری ڈاکٹر جس کو ڈنگر ڈاکٹر کہتے تھے) کے پاس برائے رپورٹ بھجوا دیا۔

کھانا نمبردار نے بھجوایا تھا۔ کھانا کھا کر میں نے سب سے پہلے مقتول کے بڑے بھائی کو اپنے پاس بٹھایا اور پہلا سوال یہ کیا کہ مقتول کہ ذاتی یا خاندانی دشمنی کس ساتھ تھی۔ مجھ کو جواب ملا کہ خونی دشمنی کسی کے ساتھ نہیں تھی۔ میرا دوسرا سوال یہ تھا کہ مقتول کہاں سے آ رہا تھا۔ مجھ کو جواب ملا کہ وہ ایک دوست کی بیٹی کی شادی پہ گیا تھا اور وہیں سے واپس آ رہا تھا۔

یہ واردات رہزنی کی نہیں تھی۔ مقتول کی جیب میں ایک سو روپے سے زیادہ رقم تھی جو اُن وقتوں میں معمولی رقم نہیں تھی۔ مقتول کی انگلی میں سونے کی وزنی انگوٹھی تھی اور گلے میں پان کے پتے کا تعویز تھا۔ یہ بھی سونے کا تھا۔ اس طرح مقتول رہزنوں کے واسطے موٹا شکار تھا لیکن سارا مال لاش کے ساتھ موجود تھا۔ اس کے علاوہ دن کا پچھلا پہر رہزنی کا وقت نہیں تھا۔ یہ واردات انتقامی قتل کی تھی۔ اگر دیرینہ اور خاندانی دشمنی نہیں تھی تو قتل کا باعث فوری اشتعال ہو سکتا تھا۔ مقتول نے کسی عورت پر دست درازی کی ہو گی یا اس کے کسی کے ساتھ تعلقات ہوں گے اور موقعہ پر پکڑا گیا ہو گا اور مارا گیا۔ میں نے قتل کے طریقے پر توجہ دی تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ قاتل ایک سے زیادہ تھے اور وہ بے وقوف تھے۔

انہوں نے قتل کو حادثہ بنانے کی سکیم بنائی تھی لیکن سکیم ناکام ہو گئی۔

"چوہدری صاحب!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "آپ کا چھوٹا بھائی قتل ہو گیا ہے۔ آپ ضرور چاہتے ہوں گے کہ قاتل کو آپ اپنے ہاتھوں قتل کریں مگر چوہدری صاحب قاتل اُس وقت تک نہیں پکڑا جائے گا جب تک آپ مجھ کو ہر بات نہیں بتائیں گے۔ مثلاً یہ کہ آپ کے بھائی کی عادتیں کیسی تھیں اور اُس کا اخلاق کیسا تھا۔ اگر آپ کو پتہ ہو تو یہ بھی بتا دیں کہ اس نے کسی عورت کے ساتھ خفیہ تعلقات رکھے ہوئے ہوں گے۔ میں آپ کو یہ بتا دیتا ہوں کہ آپ کے بھائی سے کسی نے بدلہ لیا ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ بدلہ بے عزتی کا لیا جاتا ہے یا کسی کو اتنا زیادہ نقصان پہنچایا جائے جس سے اُس کی کمر ٹوٹ جائے تو وہ شخص اسی طرح وحشی بن کر انتقام لیتا ہے۔"

"وہ ایسا آدمی تو نہیں تھا" ـــــ مقتول کے بھائی نے جواب دیا ـــــ "شوقین مزاج ضرور تھا، زندہ دل بھی تھا لیکن کوئی اوچھی حرکت نہیں کرتا تھا بلکہ اپنا رُعب داب قائم رکھتا تھا.... اُس کی ایک دشمنی تو ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ لوگ اتنی جرأت والے نہیں کہ اس کو قتل کر دیتے۔"

"کون ہیں وہ؟" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "اور دشمنی کیا ہے؟"

"وہ میرے بھائی کے پہلے سسرال ہیں" ـــــ اُس نے جواب دیا۔

"پہلے سسرال؟" ـــــ میں نے ذرا حیران ہو کر پوچھا ـــــ "کیا پہلی بیوی مر گئی ہے یا اُس کو طلاق دے دی تھی؟"

"نہ مری ہے نہ طلاق ہوئی ہے" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "اُس کی موجودگی میں میرے بھائی نے دوسری شادی کر لی تھی اور پہلی بیوی کو بھی گھر میں آباد رکھا۔"

"دوسری بیوی جوان ہو گی؟"

"جوان بھی نہیں جی!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "نوجوان کہیں۔ دوسری بیوی کی عمر اکیس بائیس سال ہو گی اور شادی ہوئے ابھی مشکل سے ایک سال ہوا ہے۔"

اُس کے اس انکشاف نے مجھ کو چونکا دیا۔ دوسری شادی قتل کا باعث بن سکتی تھی۔ میں نے مقتول کے بھائی کو کہا کہ وہ مجھ کو ساری بات سنائے کہ پہلی بیوی کے ساتھ مقتول کا کیا سلوک تھا۔ وہ بیوی کیسی ہے اُس کی اولاد کتنی ہے اور نئی بیوی آجانے سے گھر کے حالات کیا ہو گئے تھے اور پہلے سسرال کا مقتول کے ساتھ رویّہ کیا ہو گیا تھا۔

"کیا بتاؤں جناب!" ـــــ مقتول کے بھائی نے لمبا سانس لے کر کہا ـــــ "میرے لیے تو یہ شرمندگی ہی شرمندگی تھی۔ اسحٰق کی پہلی بیوی صرف بیوی ہے کوئی خاص شکل و صورت نہیں اور رنگ ہماری طرح گندمی ہے۔ ان کے تین بچے ہوئے۔ بڑا لڑکا بیس سال سے اوپر کا ہو گیا ہے۔ اس کے بعد بیٹی ہے جو سولہ سترہ سال کی ہو گئی ہے۔ پھر تیرہ چودہ سال عمر کا ایک لڑکا ہے۔ اولاد ہوتی رہی لیکن میاں بیوی میں کھینچا تانی ہی ہوتی رہی میرا بھائی بیوی کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہا۔ جب دیکھو لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ مجھے پتہ چلتا تھا تو میں آ کر دونوں کو گالی گلوچ کرتا تھا لیکن اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ جناب عالی! دل پھٹ جائیں تو کسی بھی بات کا اثر نہیں ہوتا۔"

"دوسری شادی کی وجہ بھی یہی ہو گی؟"

"ہاں جناب!" ـــــ اس نے جواب دیا ـــــ "یہی وجہ ہو سکتی ہے۔ میں تو اُن لوگوں پر حیران ہوا کرتا ہوں جو اتنی زیادہ عمر کے آدمیوں کو اپنی جوان بیٹیاں دے دیتے ہیں۔"

"چلیے، اُس نے دوسری شادی کر لی" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "پھر کیا ہوا؟ کیا پہلی بیوی اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی تھی؟"

"نہیں جی!" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "وہ اتنے کچے لوگ نہیں۔ پہلی بیوی نے اپنا اڈہ اُکھڑنے نہیں دیا۔ وہ دھڑلے سے اسی گھر میں رہی اور لڑائی جھگڑے پہلے سے زیادہ ہونے لگے۔ اب تو یہ عورت اپنے خاوند کی پرواہ ہی نہیں کرتی تھی۔ اُس کا بڑا بیٹا اُس کے ساتھ تھا اور وہ باپ کا سخت مخالف تھا۔ بیٹی بھی اپنی ماں کی حمایت کرتی تھی اور چھوٹا بیٹا بھی۔ میں تو یہ کہوں گا کہ بڑا بیٹا باپ کا دُشمن ہو گیا تھا۔

"پہلی بیوی دوسری بیوی کو گھر میں ٹکنے نہیں دیتی تھی میری موجودگی میں ایک روز اس نے اپنی نوجوان سوکن کو کہا تھا کہ اپنے آپ کو میرے خاوند کی بیوی نہ سمجھو تم خریدی ہوئی آئی ہو۔ بکری اور گائے کی طرح ایک جگہ بندھی رہو۔"

"اس پر بھی اسحٰق اپنی پہلی بیوی کے ساتھ لڑتا جھگڑتا ہوگا؟"

"اس گھر میں یہ شغل جاری ہی رہتا تھا"۔۔۔۔ اسحٰق کے بھائی نے جواب دیا۔۔۔ "لیکن دوسری شادی کے بعد جب اسحٰق نے دیکھا کہ گھر کی حالت پہلے سے زیادہ خراب ہو گئی ہے تو اس نے دوسری بیوی کو الگ کر دیا۔ اُس کی حویلی بہت بڑی ہے۔ اس کا ایک حصہ الگ ہے۔ دوسری بیوی اس حصے میں رہتی ہے۔ اُس کا چولہا بھی وہیں ہے اور اُس کے لیے الگ نوکرانی ہے۔ اس سے یہ لڑکی اپنی سوکن سے محفوظ رہتی ہے۔"

"اسحٰق کی پہلی بیوی کے بھائی کتنے ہیں؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ "اور وہ کیسے لوگ ہیں؟..... اسی شہر کے رہنے والے ہوں گے؟"

"نہیں جناب!"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "وہ اس شہر کے رہنے والے نہیں۔ وہ ایک گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ چھ سات دنوں سے اسحٰق کی پہلی بیوی اپنی اولاد سمیت گاؤں گئی ہوئی ہے..... اُس کے تین بھائی ہیں۔ آپ نے پوچھا ہے کہ وہ کیسے لوگ ہیں، اُنہیں میں بدمعاش تو نہیں کہتا لیکن میں اُنہیں شریف آدمی بھی نہیں کہوں گا۔ اپنا سر اونچا رکھتے ہیں اور کسی کو بلاوجہ سر نہیں اُٹھانے دیتے۔"

"کیا اسحٰق کی پہلی بیوی ویسے ہی اپنے گاؤں چلی گئی تھی؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ "یا لڑ جھگڑ کر گئی ہے؟"

"زبردست لڑائی جھگڑا ہوا تھا"۔۔۔ اسحٰق کے بھائی نے جواب دیا۔۔۔ "اتنا زبردست کہ اسحٰق نے پہلی بیوی کو مارا پیٹا بھی تھا اور پھر یہ بھی ہوا کہ بڑا بیٹا باپ پر لوٹ پڑا تھا۔ مجھ کو کسی نے بتایا کہ اصغر (بڑے بیٹے) نے باپ پہ ہاتھ اٹھایا ہے۔ میں دوڑا گیا اور اس گھر میں وہ تماشہ دیکھا جس نے ہمارے خاندان کی عزت خاک میں ملا دی۔ اصغر کو اُس کی ماں اور

بہن پکڑ کر پرے گھسیٹ رہی تھیں اور اصغر کہہ رہا تھا کہ اس شخص (اسحٰق) کو میں اپنا باپ نہیں سمجھتا۔ اصغر کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ اسحٰق کا چھوٹا بیٹا بھی باپ کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔۔۔۔

"میں نے اصغر کے مُنہ پر تھپڑ مارا اور کہا کہ وہ اپنے باپ کی بے عزتی کر رہا ہے۔ اس نے میری تو عزت کی لیکن اپنے باپ کو پہلے سے زیادہ گندی باتیں کہنی شروع کر دیں اور اُس نے یہ بھی کہا کہ میں اس کو کس طرح باپ کہوں جس نے میری ماں کی زندگی جہنم جیسی بنائی ہوئی ہے۔ لڑکے نے یہ بھی کہا کہ میں اس باپ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔۔۔۔ میں نے بہتر یہ سمجھا کہ اسحٰق کی بیوی اپنے بچوں کو ساتھ لے کر کچھ دنوں کے واسطے گاؤں چلی جائے۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ لڑکا نوجوان ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ماں اس کے کان میں کچھ پھُونک کر بھڑکا دے اور لڑکا جوانی کے جوش میں آ کر کوئی خطرناک حرکت کر بیٹھے۔ میرے کہنے پر یہ عورت گاؤں چلی گئی۔ جب وہ چلی گئی تو اسحٰق میرے آگے رو پڑا کہ اُس کی اولاد اُس کی دُشمن ہو گئی ہے۔"

جب میں مقتول کے بھائی سے پوچھ گچھ کر رہا تھا تو مجھ کو اچانک مقتول کے سسرال کے گاؤں کا خیال آیا۔ جہاں مقتول کو روکا گیا تھا اور اُس کو میرے خیال کے مطابق گھوڑی سے اُتارا گیا وہ جگہ مقتول کے سسرال

بیٹے اصغر شاہ کو شامل تفتیش کرنا ضروری ہو گیا۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ اُن کو اپنے پاس بلا لیتا لیکن میں نے زیادہ دہشت ناک طریقہ اختیار کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ تھا چھاپہ یعنی اُن کے گاؤں جا کر اُن کے گھر پر چھاپہ مارنا۔ چھاپے کا وقت نہایت مناسب تھا۔ مجھ کو آج تک یاد ہے کہ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ دیہات کے تھکے ہوئے لوگ سورج ڈوبنے کے فوراً بعد سو جایا کرتے تھے اور گیارہ بجے تو اُن کو ہوش ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت کا چھاپہ زیادہ اچھا ہونا تھا۔

میں نے ہیڈ کانسٹیبل مُرشد کو اندر بُلا کر کہا کہ فلاں گاؤں مقتول کے

سسرال کے گھر چھاپہ مارنے جانا ہے۔

"وہ لوگ تو یہاں ماتم پہ آئے ہوئے ہوں گے" ـــــ ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

"شاید نہ آئے ہوں" ـــــ میں نے کہا ـــــ "اُن کی ناراضگی تھی"۔

"کیا آپ اپنے لوگوں کے دستور کو نہیں جانتے؟" ـــــ ہیڈ کانسٹیبل نے کہا ـــــ "ناراضگی کتنی ہی گہری کیوں نہ ہو، ناراض رشتہ دار ماتم پر ضرور جاتے ہیں اور جنازہ پڑھ کر اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں"۔

پتہ کروایا تو ہیڈ کانسٹیبل کی بات صحیح نکلی۔ مقتول کی بیوی اُس کے دونوں بیٹے اور بیٹی، بیوی کے تینوں بھائی اور اُن کی ماں وغیرہ یعنی سب آ گئے تھے۔ اُن کو اطلاع بھیجی گئی تھی۔ میں نے مقتول کے تینوں سالوں اور اُس کے بڑے بیٹے کو بلا کر باہر بٹھا دیا۔

کے گاؤں سے بمشکل ایک میل یا پون میل دُور تھی۔ میرے دماغ میں وہ دو کھرے آ گئے جو جائے وقوعہ سے جاتے ہوئے میں نے دیکھے تھے۔ اُن کا رُخ اسی گاؤں کی طرف تھا۔ میرا یہ شک پختہ ہو گیا کہ مقتول کو روکنے والے اس کے سالے تھے اور ہو سکتا ہے اُس کا بڑا بیٹا بھی اُن کے ساتھ ہو۔

مقتول کی پہلی بیوی مقتول سے پٹائی کرا کر گئی تھی۔ اُس نے اور اُس کی اولاد نے گاؤں جا کر بڑھ چڑھ کر سنایا ہو گا کہ یہ لڑائی کتنی سخت تھی۔ مقتول کے سسرال میں یہ دُشمنی پہلے سے ہی موجود تھی کہ مقتول نے دوسری شادی کر لی تھی۔

"چوہدری صاحب!" ـــــ میں نے مقتول کے بڑے بھائی سے پوچھا ـــــ "کیا آپ کو یہ خیال آتا ہے کہ آپ کے بھائی کے قاتل اس کے سالے ہیں؟"

"بالکل آتا ہے جناب!" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "اُن کو پتہ لگ گیا ہو گا کہ اسحٰق فلاں جگہ شادی پر گیا ہے۔ انہوں نے اُس کو آتے دیکھ لیا ہو گا اور چھپ کر راستے میں بیٹھ گئے اور اُس کو روک کر مار ڈالا ہو گا"۔

کھوجی کھرے دیکھ کر آ گیا تھا۔ میں نے کھروں کی بابت جو رائے قائم کی تھی وہی رائے کھوجی کی تھی۔ اُس نے یقین کے ساتھ کہا کہ دو

کھرے اُسی گاؤں کی طرف جاتے ہیں مشکل یہ پیدا ہو گئی تھی کہ آگے جا کر کھرے دیکھنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ بہرحال میں نے یہی سمجھا کہ کھرے گاؤں تک گئے ہیں۔ اور یہ کھرے مقتول کے سالوں کے ہیں۔

مقتول کی پہلی بیوی کے تینوں بھائیوں کو اور مقتول کے بڑے

پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی آگئی اور لاش بھی آگئی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ وہی تھی جو میں پہلے بتا چکا ہوں۔ مقتول کی موت گلا رسی سے گھونٹنے سے واقع ہوئی تھی۔ میں ڈاکٹروں کی زبان سے ناواقف ہوں۔ ڈاکٹر نے اپنے علم کے مطابق ثابت کیا تھا کہ جسم پر باقی جو زخم ہیں وہ اُس وقت آئے تھے جب مقتول کے جسم میں خون کی گردش رُک چکی تھی۔

میں نے مقتول کے تینوں سالوں اور اُس کے بیٹے اصغر کو اندر بلایا اور اُن کے جوتے دیکھے۔ جائے وقوعہ پر جو کھرے تھے وہ شہری شوز کے تھے۔ اصغر نے شوز پہنے ہوئے تھے اور اُس کے تینوں ماموں دیسی جوتیاں پہنے ہوئے تھے۔ مجھ کو اصغر کا پاؤں چھوٹا لگتا تھا۔

میں نے ان کو باہر بھیج دیا۔ اُن کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔ میرے ذہن میں ایک اور چیز اٹک گئی تھی۔ اصغر بیس اکیس سال کا خوبرو نوجوان تھا۔ میں پھر بھی آپ کو بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اُن وقتوں میں مرد کی خوبصورتی کا معیار کچھ اور ہوتا تھا۔ آج کل کچھ اور ہے۔ آج کل نوجوان مرد اپنے آپ میں زنانہ خوبصورتی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن وقتوں میں چہرے کے نقش دیکھ کر یہ بھی دیکھا جاتا تھا کہ چہرے پر مردانہ وقار ہے یا نہیں، پھر دیکھتے تھے کہ قد کتنا اونچا ہے اور جسم کے پٹھے بنے ہوئے ہیں یا نہیں اور جسم میں طاقت کتنی ہے۔

اس معیار کے مطابق اصغر میں مردانہ کشش تھی۔ اُس کو دیکھ کر مجھ کو خیال آیا کہ اُس کے باپ کی دوسری بیوی اُس کی ہم عمر ہے۔ مجھ کو شک ہونے لگا کہ دوسری بیوی نے اصغر کے ساتھ خفیہ تعلق پیدا کر لیا ہو گا۔ باپ کو وہ اپنی ماں کی وجہ سے اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ اب اس لڑکی نے گھر میں آکر باپ بیٹے کو ایک دوسرے کا پکا دشمن بنا دیا ہو گا اور قتل

کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے۔

میں نے ارادہ کیا کہ پہلے مقتول کے گھر کے اندر کے حالات اور افراد کے چال چلن وغیرہ کی بابت معلوم کر لوں۔ یہ کام کسی بھی نمبردار کے واسطے مشکل نہیں ہوتا۔ میں نے نمبردار کو بلایا اور اس سے اپنی ضرورت کی باتیں پوچھیں۔ اس نے شروع میں وہی باتیں بتائیں جو مقتول کا بڑا بھائی بتا چکا تھا۔

"تم جانتے ہو میں کیا معلوم کرنا چاہتا ہوں" ـــــ میں نے نمبردار کو کہا ـــــ "اندر کی باتیں بتاؤ۔ تم کیا سمجھتے ہو قاتل کون ہے؟" ـــــ میں نے ریشمی رومال اس کے آگے پھیلا کر پوچھا ـــــ "بتا سکتے ہو یہ رومال کس کا ہے؟"

"نہیں حضور!" ـــــ نمبردار نے کہا ـــــ "اس شہر میں ایسا رومال ایک ہی تو نہیں کئی لڑکوں کے پاس ہوگا۔ میں دوسری باتیں بتاتا ہوں جو مجھ کو معلوم ہیں اور جو معلوم نہیں وہ معلوم کر لوں گا..... چوہدری اسحٰق رنگین مزاج تو ضرور تھا لیکن کسی کی بہو بیٹی پر بری نظر رکھنے والا نہیں تھا۔ اس نے کبھی ایسی ویسی جھک نہیں ماری تھی۔ یہ صحیح ہے کہ پہلی بیوی کو وہ پسند نہیں کرتا تھا۔"

"دوسری بیوی کیسی لڑکی ہے؟"

"ٹھیک لڑکی ہے" ـــــ اس نے جواب دیا ـــــ "سنا تھا ایک لڑکے کے ساتھ اس کا پیار محبت تھا اور یہ بھی سنا تھا کہ لڑکی کی شادی اسی لڑکے کے ساتھ ہو جائے گی۔ لڑکی کے بھائی کا بڑا گہرا دوست ہے تیئس چوبیس سال عمر کا ہے۔"

"کیسا ہے؟"

"مضبوط دل گردے والا ہے" ـــــ نمبردار نے جواب دیا ـــــ "سنا تو یہ بھی ہے کہ لڑکی کی شادی اسحٰق کے ساتھ ہو گئی تو بھی یہ لڑکا لڑکی کے ساتھ ملتا ملاتا ہے۔"

میں نے اس شک کو بھی سامنے رکھا ہوا تھا کہ لڑکی کی دوستی یا محبت کسی نوجوان کے ساتھ ہو گی اور اس نوجوان نے اسحٰق کو راستے سے ہٹا دیا

ہو گا لیکن شادی ہوئے ایک سال گزر گیا تھا۔ بہر حال میں نے اس شک کو ذہن میں رکھا۔ نمبردار کے ساتھ باتیں کرتے ایک اور بات کا پتہ لگا۔ میں نے کہا کہ لڑکی اسحق کے ساتھ خوش نہیں ہو گی۔

"اس شادی کے پیچھے کوئی راز ہے" ـــــ نمبردار نے کہا ـــــ "اس شادی سے پہلے کا واقعہ ہے کہ اسحق کی بیوی کا سونے کا ہار اور ایک انگوٹھی گم ہو گئی تھی۔ اُس نے کہیں سے واپس آکر یہ چیزیں اُتار کر کہیں سامنے رکھ دیں اور دونوں چیزیں غائب ہو گئیں۔ اسحق نے میرے ساتھ بات کی تو میں نے اُس کو ساتھ لیا اور تھانے میں چوری کی رپورٹ لکھوا دی۔ یہ آپ سے پہلے والے تھانیدار صاحب تھے۔ انہوں نے تفتیش کی تھی۔ وہ اسحق کے گھر بھی آئے تھے.....

"پھر حضور! آٹھ دس روز بعد پتہ لگا کہ اسی محلے کے ایک آدمی سے دونوں چیزیں برآمد ہو گئی ہیں۔ برآمد اس طرح ہوئیں کہ یہ آدمی جس کی عمر چوبیس سال کے لگ بھگ تھی، جوئے کا عادی تھا۔ اُس نے ہار اور انگوٹھی ہار دی۔ جس نے یہ چیزیں جیتیں وہ ان کو ایک سنار کے پاس لے گیا۔ سنار کو کسی طرح پتہ تھا کہ ایک گھر سے یہ دو چیزیں چوری ہوئی ہیں۔ اُس نے پولیس کو اطلاع دے دی اور اس آدمی کو پکڑوا دیا۔ اس آدمی نے بتا دیا کہ اُس نے یہ چیزیں کس سے جیتی ہیں اور اُس نے یہ بھی کہا کہ اُس کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ چیزیں چوری کی ہیں.....

"تھانیدار صاحب نے اصل چور کو پکڑ لیا۔ مجھ کو تھانے سے پتہ لگ گیا تھا کہ کیا کارروائی ہوئی ہے۔ کارروائی یہ ہوئی کہ چور کو دو دن تھانے میں رکھا گیا۔ اسحق بھی تھانے جاتا رہا۔ تیسرے دن چور کو چھوڑ دیا گیا اور اس کے پندرہ بیس دنوں بعد چور کی نوجوان بہن کی شادی اسحق کے ساتھ ہو گئی۔"

ہیڈ کانسٹیبل مرشد علی اس تھانے میں پرانا تھا۔ میں نے اُس کو اندر بلا کر یہ واقعہ پوچھا تو اُس نے بتایا کہ اشرف نے جو اصل چور تھا، اقبالِ جرم کر لیا تھا۔ چوہدری اسحق نے تھانیدار کو کہا کہ یہ لڑکا چونکہ اُس کی اپنی

برادری کا ہے اس وجہ سے وہ اس کو سزا نہیں دلانا چاہتا تھا۔ وہ ایک ہندو تھانیدار تھا۔ اُس نے مقتول سے وصولی کر لی ہوگی اور کیس گول کر دیا۔

آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ چور مقتول اسحٰق کی دوسری بیوی کا بھائی تھا اور اُس نے اسحٰق کے گھر سے سونے کا ہار اور انگوٹھی کا سرقہ اُس وقت کیا تھا جب اُس کی بہن کی شادی اسحٰق کے ساتھ نہیں ہوئی تھی۔ اس چوری اور شادی پہ میں نے غور کیا تو اس میں میرے کام کی کوئی بات نظر نہ آئی۔ یہ ایک سال پرانی باتیں تھیں۔ البتہ ایک خیال میرے ذہن میں آیا ـــ کیا ایسا تو نہیں کہ لڑکی کو زبردستی اسحٰق کے ساتھ بیاہ دیا گیا ہو اور اُس نے اسحٰق کو مروا دیا ہو؟

اس صورت حال میں عموماً ایسے خاوند کو زہر دیا جاتا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ ایک سال گزر جانے کے بعد قتل کا خیال نہیں آسکتا تھا لیکن ایک اور پہلو سامنے آیا۔ وہ یہ کہ لڑکی برداشت کرتے کرتے تنگ آ گئی ہو گی اور جسے وہ چاہتی تھی وہ بھی دیوانہ ہو گیا ہو گا اور ان پر ایسا پاگل پن سوار ہوا کہ قتل کی واردات کر ڈالی۔

یہ سب قیاس اور قیافے تھے۔ میں ایسے تو نہیں کر سکتا تھا کہ بیٹھ کر سوچتا رہتا۔ میں نے جلدی سے جلدی قاتل یا قاتلوں کو پکڑنا تھا۔ اس قسم کی وارداتوں کی تفتیش میں تفتیش کرنے والے افسروں کو سوچنا تو بہت پڑتا ہے لیکن حرکت زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ پولیس کے پاس دوسرا طریقہ بھی ہوتا ہے جس کو انگریزی میں تیسرا طریقہ یعنی تھرڈ ڈگری کہتے ہیں۔ یہ طریقہ اس طرح آزمایا جاتا ہے کہ جو مشتبہ آیا اس کو الگ لے گئے اور اُس کی ہڈی پسلی ایک کرنی شروع کر دی۔

میں اس طریقے کے خلاف تھا۔ خلاف ہونے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں رحمدل تھا۔ تفتیش میں رحم دلی نہیں چلا کرتی۔ خلاف ہونے کی وجہ دراصل یہ تھی کہ مار پیٹ کر کسی سے کچھ کہلوانا اور اُس کے بیان پر اعتبار کر لینا کورٹ میں مقدمے کو تباہ کر دیتا ہے۔ البتہ کبھی کبھار تھرڈ ڈگری کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

نمبردار نے ایک تو مجھ کو یہ بتایا کہ جس لڑکی کے ساتھ مقتول کی دوسری شادی ہوئی تھی وہ کسی اور کو چاہتی تھی اور جس کو وہ چاہتی تھی وہ اُس کو ابھی تک ملتا ملاتا تھا۔ اس لڑکی کا نام محمودہ تھا اور مُودی کے نام سے بلائی جاتی تھی۔

نمبردار نے دوسری بات یہ بتائی کہ مقتول کی بیٹی جس کی عمر سترہ سال کے لگ بھگ تھی کچھ بدنام تھی۔ اُچھلتی کودتی اور نوجوان لڑکوں میں دلچسپی رکھتی تھی۔ مقتول کے بیٹے اصغر کی رپورٹ بھی اچھی نہیں تھی۔ اِدھر اُدھر چھیڑ چھاڑ میں خوش رہتا تھا۔

ایسے ماں باپ کی اولاد اچھی ہو ہی نہیں سکتی تھی جو آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہوں۔ گھر میں پیار محبت نہ ہو، سکون نہ ہو تو بچے باہر جا کر اپنے آپ کو خوش کرنے کے طریقے اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ طریقے عام طور پر مجرمانہ ہوتے ہیں۔ اسحٰق کی اولاد کا ذہن مجرمانہ ہونا لازمی تھا۔ یہ عجیب نہیں تھا کہ باپ کو بیٹے نے ہی قتل کر دیا ہو۔

میں نے ایک آدمی کو مقتول کے سسرال والے گاؤں کے نمبردار کو بلا لانے کے لیے بھیجا تو وہ باہر جا کر واپس آ گیا۔ کہنے لگا کہ وہ نمبردار ماتم پر آیا ہوا ہے۔ اسحٰق کا میل جول اور رکھ رکھاؤ سب کے ساتھ تھا جس وجہ سے اُس کے مرنے پر بہت سارے لوگ دوسرے دیہات سے آ گئے تھے۔ میں نے اُس گاؤں کے نمبردار کو بلایا اور اُس سے مقتول کے سالوں کی بابت پوچھا۔ اُس نے وہی رائے دی جو اسحٰق کے شہر کا نمبردار دے چکا تھا۔

میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ قتل کی ہمت رکھتے ہیں یا نہیں اور یہ کہ اُن کی بہن لڑائی جھگڑا کر کے گئی تھی۔ اس پر اس کے بھائیوں کا ردِ عمل کیا ہے۔ گاؤں اور محلے میں کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔

"اسحٰق کے سالے بہت غصے میں تھے" ـــــ نمبردار نے بتایا ـــــ "اُن میں جو سب سے بڑا ہے اُس نے مجھ کو کہا تھا کہ اب اسحٰق نہیں یا اس کی دوسری بیوی نہیں.... اسحاق کی بیوی کہتی پھرتی تھی کہ مجھ کو اس خاوند کی ضرورت نہیں، مرے چاہے جئے، میرے بچے جوان ہو گئے ہیں۔ باپ کی

جائیداد کے وارث ہیں۔ وہ یہ بھی کہتی ہے کہ اسحٰق جتنی جلدی مرے اتنی جلدی میرے بیٹوں کو جائیداد ملے گی۔"

"کیا تم نے یا کسی اور نے اس عورت سے پوچھا نہیں تھا کہ وہ اپنے خاوند کے پاس جائے گی یا نہیں؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"میں نے اس کے تینوں بھائیوں کو ایک مشورہ دیا تھا" ــــ نمبردار نے جواب دیا ــــ "میں نے ان کو کہا تھا کہ وہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھیں کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔ میں نے ان کو یہ مشورہ دیا تھا کہ بہن کو تو وہ واپس ہی بھیجیں گے لیکن وہاں آباد ہونے کے واسطے نہیں بلکہ خاوند کی جائیداد کی وارث بن کر وہاں رہے گی۔"

نمبردار نے ان بھائیوں کے ساتھ بہت ساری باتیں کی تھیں۔ اس نے یہ سب مجھ کو سنائیں۔ نمبردار بوڑھا آدمی تھا۔ ان بھائیوں کے باپ سے اس کی دوستی تھی۔ باپ مر چکا تھا۔ اسی دوستی کی وجہ سے وہ اپنے دوست کے بیٹوں کو کوئی غلط حرکت کرنے سے روک رہا تھا لیکن بھائی غصے میں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ بہن کو واپس تو بھیج دیں گے لیکن بے عزتی کا بدلہ ضرور لیں گے۔ میں نے آپ کو سنایا ہے کہ اسحٰق نے اپنی بیوی کو زدوکوب کیا تھا۔

نمبردار کی سنائی ہوئی باتوں سے میں نے یہ لب لباب حاصل کیا کہ ان بھائیوں کو اپنی بہن اور اس کی اولاد کے واسطے اسحٰق کی زندگی کی نہیں بلکہ اس کی جائیداد کی ضرورت تھی۔ اس سے میرے دماغ میں یہ سوچ آئی کہ ان تینوں نے یہ بھی سوچا ہوگا کہ اس سے پہلے کہ اسحٰق کی دوسری بیوی جائیداد کا ایک اور وارث پیدا کر دے اسحٰق کو دنیا کے تختے سے اٹھا دیا جائے۔

میں نے اس نمبردار کو قتل کا اندازاً وقت بتا کر پوچھا کہ اپنے گاؤں سے یہ معلوم کر کے مجھے بتائے کہ اس وقت اسحٰق کے سالے یا بیٹا یا یہ سب گاؤں میں تھے یا کسی نے ان کو جائے وقوعہ کی طرف جاتے یا ادھر سے آتے دیکھا ہو۔

"میری ایک بات غور سے سن لو" ــــ میں نے نمبردار کو خبردار کرنے

کے واسطے کہا ۔۔۔ "ان کا باپ تمہارا دوست تھا۔ اِن پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کرنا۔ مجھ کو سچی بات دوسروں سے معلوم ہو جائے گی پھر تم جانتے ہو مَیں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا۔"

"وہم نہ کریں حضور!" ۔۔۔ اُس نے دونوں ہاتھ اپنے ماتھے پر رکھ کر کہا ۔۔۔ "مَیں تو حضور کا نمک خوار ہوں۔ آپ نے جو بات پوچھی ہے اس کا ابھی جواب سن لیں، کسی اور سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے.... مَیں اپنے ایک کھیت میں کھڑا تھا۔ اسحٰق کا بڑا اور اُس سے چھوٹا سالا اُدھر سے آتے میں نے خود دیکھے تھے لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ جائے وقوعہ سے آ رہے تھے یا کہیں اور گئے تھے۔ وہ اُسی طرف سے آ رہے تھے۔"

مَیں پہلے بتا چکا ہوں کہ جائے وقوعہ سے یہ گاؤں تقریباً ایک میل یا اس سے کچھ زیادہ دُور تھا۔

اس نمبردار کے بعد مَیں نے سفید پوش اور ذیلدار کو باری باری بلا کر اُن سے تمام متعلقہ افراد کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے بھی اسحٰق کی بیٹی کی ٹھیک رپورٹ نہ دی۔ اسحٰق کی دوسری بیوی مُودی کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ خالق نام کے ایک نوجوان کو جانتی ہے۔ خالق مُودی کے بھائی کا دوست تھا۔ اس کے سوا مُودی کی کسی کے ساتھ راہ و رسم نہیں تھی اور کبھی کسی نے اُس کے چال چلن کو خراب نہیں کیا تھا۔ سفید پوش اور ذیلدار نے اسحٰق کے خاندان کو گندہ خاندان کہا۔

صبح ہو گئی۔ اسحٰق کے گھر عورتیں رو رہی تھیں۔ میں ساری رات ماتم کی آہ و زاری سُنتا رہا تھا۔ میں ایک سیکنڈ بھی نہیں سویا۔ دماغ تھک گیا تھا اور ابھی تک میں قتل کا باعث معلوم نہیں کر سکا تھا۔ مجھ کو غصہ آنے لگا۔

نمبردار کے گھر سے ناشتہ آیا۔ ناشتہ کر کے میں باہر نکلا اور ویسے ہی گلی میں ٹہل کر اندر جا بیٹھا۔ اسحٰق کے تینوں سالوں اور اُس کے بیٹے کو میں نے باہر بٹھایا ہُوا دیکھا تھا۔

مَیں نے بڑے سالے کو اندر بُلایا۔ وہ کم و بیش چالیس سال عمر کا آدمی

تھا۔ اُس کے چہرے پر رُعب اور وقار تھا۔ میرے سامنے آ کر اُس نے اپنے چہرے پر ایسے تاثرات پیدا کر لیے جیسے اُس کو میرا کوئی ڈر نہیں اور اُس کو معمولی آدمی نہ سمجھا جائے۔ مَیں نے اُس کو بٹھایا۔

"ایک عرض کروں جناب!" ۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ ہمارے بہنوئی کی میت گھر میں پڑی ہے اور آپ نے ساری رات ہمیں یہیں بٹھائے رکھا۔"

"بہنوئی کا اتنا درد کب سے پیدا ہُوا ہے چوہدری؟" ۔۔۔ مَیں نے پوچھا۔

"بہنوئی کا درد نہیں ہوتا جناب؟" ۔۔۔ اُس نے پوچھا۔

"بہنوئی کی میت اِدھر شہر کی طرف کیوں بھیج دی تھی چوہدری!" مَیں نے کہا ۔۔۔ "گھوڑی کا منہ اپنے گاؤں کی طرف کر کے بھگاتے تو میت تمہارے گھر پہنچ جاتی۔"

اس کے چہرے پر حیرت آ گئی۔ عجیب سی نظروں سے مجھ کو دیکھنے لگا۔

"دیکھ چوہدری!" ۔۔۔ مَیں نے کہا ۔۔۔ "سیدھی بات کر.... اپنے بہنوئی کو خود قتل کیا ہے یا کسی سے کروایا ہے؟"

اُس نے بڑے بارُعب طریقے سے انکار کیا اور حیرانگی سے کہا کہ مَیں نے اُس پر قتل کا الزام لگایا ہے۔

"آپ نے مجھ پر یہ شک کیوں کیا ہے جناب؟" ۔۔۔ اُس نے پوچھا۔

"سوال تم نہ کرو" ۔۔۔ مَیں نے کہا ۔۔۔ "ابھی مجھ کو سوال کرنے دو، تم صرف جواب دو۔ مَیں نے آخر کچھ سوچ کر تم پر الزام لگایا ہے اور مَیں یہ الزام ثابت بھی کر دوں گا لیکن چوہدری! یہ سن لو۔ اگر مَیں نے تمہیں قاتل ثابت کر دیا تو وکیلوں کی پوری پلٹن عدالت میں لے آؤ گے تو بھی پھانسی سے کم سزا نہیں پاؤ گے۔ اگر اقبالی بیان دے دو گے تو وعدہ کرتا ہوں کہ مقدمے میں ایسی گنجائش رکھ دوں گا کہ ہائی کورٹ سے اپیل میں بری ہو جاؤ گے۔"

"پھانسی منظور ہے تھانیدار صاحب!" ۔۔۔ اُس نے بڑی دلیری سے

کہا ـــ "اگر میں قاتل ہوں تو عدالت میں ثابت کر دینا۔"

میرے پاس سوائے دو چار زبانی باتوں کے کوئی شہادت نہیں تھی. کوئی ثبوت نہیں تھا۔ میں نے اُس پر جرح شروع کر دی۔

"چوہدری!" ـــ میں نے پہلا سوال کیا ـــ "تم اُس جگہ سے واقف ہو جہاں تمہارے بہنوئی کی گھوڑی کو روکا گیا تھا...."

"میں نے وہ جگہ دیکھی تھی جب آپ اُس جگہ کا ملاحظہ کر کے آئے تھے" ـــ اُس نے مجھ کو ٹوک کر کہا ـــ "خبر ہمارے گاؤں پہنچی تو میں اُس جگہ گیا تھا۔ وہاں ایک کانسٹیبل کھڑا تھا جو کسی کو آگے نہیں جانے دے رہا تھا۔"

"جب تک میری بات پوری نہ ہو تم چُپ رہو" ـــ میں نے غصے کو دباتے ہوئے کہا ـــ "پہلے سنو کہ مَیں کیا کہہ رہا ہوں.... مَیں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس سے پہلے تم اپنے بھائی کے ساتھ اُس جگہ گئے تھے، کیا کرنے گئے تھے؟ تمہیں کئی آدمیوں نے دیکھا تھا۔"

"میری سرکار!" ـــ اُس نے طنزیہ لہجے میں کہا ـــ "کوئی ایک آدمی ایسا دکھا دو جس نے مجھ کو اور میرے بھائی کو اُس جگہ کے قریب دیکھا ہو.... یہ ٹھیک ہے کہ مَیں اپنے بھائی کے ساتھ اُدھر گیا تھا۔ اُس جگہ سے تھوڑی دُور ہمارے دو کھیت ہیں۔ اُن میں شیشم کے تین درخت ہیں۔ ان میں سے ایک درخت کٹوانا تھا۔ میں اپنے بھائی کو ساتھ لے کر یہ دیکھنے گیا تھا کہ کون سا درخت کاٹا جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ شہر میں پلنگوں کے پائے اور میز کرسیاں بنانے والے دیہاتی علاقے میں شیشم کے درخت خریدنے کے واسطے آتے رہتے ہیں۔ ہم ایک درخت جڑ دل سے نکلوا کر بیچنا چاہتے ہیں۔"

"میری تسلی نہیں ہوئی چوہدری!" ـــ میں نے کہا۔

"جو بات آپ نے پوچھی ہے وہ مَیں نے بتا دی ہے" ـــ اُس نے کہا ـــ "آپ کی تسلی نہیں ہوئی تو مجھے بتائیں کہ میں آپ کی تسلی کس طرح کر سکتا ہوں.... ایک بات کہوں گا۔ اگر مَیں آپ کو بتاؤں کہ چوہدری اسحٰق کی دوسری بیوی کا بھائی اپنے ایک دوست کے ساتھ اُس جگہ

سے دُور کھڑا تھا تو کیا اُن کو بھی قتل کے الزام میں پکڑیں گے؟"

"اُس کے دوست کا نام جانتے ہو؟"

"وہ اُس کی بہن کا یار تھا" ــــ اُس نے غصیلی آواز میں جواب دیا۔ "اُس کا نام خالق ہے۔"

"وہ وہاں کیا کر رہے تھے؟"

"مظفر (مُودی کا بھائی) کے پاس شکاری بندوق تھی" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "وہ پرندوں کا شکار کھیلتے پھر رہے تھے۔"

"تم نے خالق کو مظفر کی بہن کا یار کیوں کہا ہے؟"

"یہ ہماری بہن سے پوچھنا" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "میں بات کروں گا تو آپ کہیں گے کہ میں غصے میں آکر جھوٹ بول رہا ہوں تھانیدار صاحب! میں سمجھ گیا ہوں کہ آپ مجھ پر کیوں شک کر رہے ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ ہم تینوں بھائیوں کے دلوں میں اپنے بہنوئی کی دُشمنی بھری ہوئی ہے۔ اُس نے ہماری بہن کو بہت تنگ کر رکھا تھا اور اب اُس کو مارا پیٹا بھی ہے لیکن ہم نے اُس کو قتل کرنے کی تو کبھی نہیں سوچی تھی۔ اگر ہم قتل کرنے والے ہوتے تو بہت عرصہ پہلے یہ کام کر چکے ہوتے۔ اب ہم نے یہ سوچا تھا کہ کچھ دن اور بہن کو گھر رکھیں گے پھر ہم تینوں بھائی اُس کو ساتھ لے کر چوہدری اسحٰق کے گھر جائیں گے اور اُس کو ڈرائیں دھمکائیں گے۔"

میں نے سوالوں پر سوال پھینکنے شروع کر دیے۔ اُس کو پریشان ہو جانا چاہیے تھا لیکن وہ فوراً جواب دیتا تھا اور پوری دلیری اور جرأت سے دیتا تھا۔ ایک وقت آیا کہ میں پریشان ہو گیا۔ مجھ کو یقین ہونے لگا کہ قتل میں اس کا ہاتھ نہیں لیکن اس کو ابھی چھوڑنا نہیں تھا۔

"کیا تم نے مظفر اور خالق کو غور سے دیکھا تھا؟"

"اچھی طرح دیکھا تھا جناب!" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "میں ان کو پہچانتا ہوں اور بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"یہ رومال دیکھو" ــــ میں نے ریشمی رومال اُس کے آگے پھیلا

کر پوچھا ـــ "اُن دونوں میں سے کسی نے گلے میں یہ رومال یا اس قسم کا رومال باندھا ہُوا تھا؟"

"غلط بات نہیں کروں گا جناب!" ـــ اُس نے کہا ـــ "مَیں نے اتنا زیادہ غور سے نہیں دیکھا تھا۔"

"چوہدری!" ـــ مَیں نے کہا ـــ "تم میری بات نہیں سمجھے۔ مان جاتے تو اچھا تھا۔ جاؤ اور باہر بیٹھ جاؤ۔"

"جناب!" ـــ اُس نے کہا ـــ "مَیں نے بھائی کے جنازے میں شامل ہونا ہے۔"

"نہیں چوہدری!" ـــ مَیں نے کہا ـــ "یہاں سے تم کہیں نہیں جاسکتے۔"

وہ مایوس ہو کر باہر جانے لگا تو مجھے کو اچانک ایک خیال آگیا۔ میں نے اُس کو روک لیا۔

"مَیں مجبور ہوں چوہدری!" ـــ مَیں نے کہا ـــ "میں مسلمان ہوں۔ جنازہ پڑھنا مجھ پر بھی فرض ہے لیکن مَیں یہاں سے ہل نہیں سکتا.... ایک بات بتاؤ۔ مظفر اور خالق کہاں کھڑے تھے؟"

"بالکل اُس جگہ کے قریب جہاں آپ نے کھُرے دیکھے تھے" ـــ اُس نے جواب دیا اور وہ سوچ میں پڑ گیا، پھر کہنے لگا ـــ "ایک بات یاد آئی ہے۔ آپ نے مجھ پر قتل کا الزام لگا کر میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ یہ بات دماغ سے نکل گئی تھی۔ بات یہ ہے کہ جب ہم دونوں بھائی درخت دیکھ کر واپس آرہے تھے تو دُور ایک آدمی گھوڑے پر سوار پگڈنڈی پر آرہا تھا۔ آپ نے وہ علاقہ دیکھا ہے۔ بہت کھُلا علاقہ ہے۔ پگڈنڈی گھوم کر گھاٹی تک آتی ہے.... میرے بھائی نے کہا کہ چوہدری اسحٰق معلوم ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا تو چوہدری اسحٰق ہی لگتا تھا۔"

"فاصلہ کتنا تھا؟"

"اڑھائی یا تین فرلانگ ہوگا" ـــ اُس نے جواب دیا ـــ "ہم دونوں اپنے گاؤں کی طرف چلے گئے۔ اگر تھوڑی دیر اور ہم وہاں کھڑے رہتے تو چوہدری اسحٰق قتل نہ ہوتا۔"

میں نے اُس کو باہر بھیج کر اُس کے دو نوں بھائیوں کو باری باری اندر بلایا۔ اُن سے میں نے یہی سوال پوچھے اور اُن پر بھی قتل کا الزام لگایا۔ انہوں نے وہی کہا جو اُن کا بڑا بھائی کہہ چکا تھا۔ جو بھائی اپنے بڑے بھائی کے ساتھ گیا تھا اُس کا بیان اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ملتا تھا۔ اُس نے بھی یہی کہا کہ وہ درخت دیکھنے گئے تھے۔ اُس نے میرے پوچھے بغیر ہی بتا دیا کہ اُس نے چوہدری اسحٰق کو گھوڑی پر آتے دیکھا تھا۔

"کیا تم اُسے ملنا چاہتے تھے؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"نہیں" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "ملنا ہوتا تو وہیں رُکے رہتے۔ پگڈنڈی گھوم کر ادھر ہی آتی تھی لیکن اُس سے ملنے یا اُس کو یہ کہنے کو دل نہیں کرتا تھا کہ چلو ہمارے گاؤں، ذرا آرام کر کے شہر جانا۔"

"تم نے مظفر اور خالق کو کہاں دیکھا تھا؟"

اُس نے وہی جگہ بتائی جو اُس کا بھائی بتا چکا تھا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ مظفر کے ہاتھ میں شکاری بندوق تھی۔

"تم چوہدری اسحٰق سے ملنا ہی نہیں چاہتے تھے" ــــ میں نے کہا ــــ "اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تم اپنی بہن کو واپس بھیجنا ہی نہیں چاہتے تھے۔"

"کیوں جی؟" ــــ اُس نے کہا ــــ "بھیجنا کیوں نہیں چاہتے تھے؟ اُس کو ہم نے تین چار دنوں کے بعد بھیج دینا تھا" ــــ اُس نے میری طرف جھک کر آہستہ سے کہا ــــ "آپ خود عقل والے افسر ہیں جناب! بہن کو گھر بٹھا کر ہم اُس کے بچوں کا نقصان کیوں کرتے؟ اس کے خاوند کی جائیداد ہے۔ اُس کے گھر میں نئی اور خوبصورت دُلہن آگئی ہے۔ وہ اپنا چکر چلا کر ہماری بہن کے خاوند سے جائیداد اپنے نام لکھوا سکتی ہے۔ پوری نہیں تو آدھی ضرور لکھوا لے گی۔ آپ جانتے ہیں کہ بوڑھے دماغ پر نوجوان بیوی کا نشہ کس طرح چڑھا کرتا ہے۔ جائیداد کے وارث ہماری بہن کے بیٹے ہیں . . .

"آپ ہم پر قتل کا الزام لگاتے ہیں۔ جنابِ عالی! ہمیں ایسا بے غیرت نہ سمجھیں۔ کہنے کو تو ہم نے ہزار بار کہا ہوگا کہ اس کا سر اتار دو۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ دیہات میں کسی کو کسی پر غصہ آجائے تو وہ یہ ضرور کہتا ہے کہ میں اس کا سر اُتار دوں گا۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم نے اپنی بہن کے خاوند کا سر اُتار دیا ہے۔ اگر ہم ایسے بے غیرت ہو جاتے تو لوگ یہی کہتے کہ بے غیرتوں نے اپنی بہن کو بیوہ کر دیا ہے۔ اگر ہم نے قاتل ہی بننا تھا تو اپنی بہن کی سوکن کو قتل کرتے۔ خدا کی قسم ہمارے لیے یہ کام مشکل نہیں۔ اب تو چوہدری مر گیا ہے۔ نہ مرتا تو ہم نے اُس کو تنگ کرنے کے واسطے ایک اور چکر چلایا تھا۔ اُس کے بیٹوں کو ہم نے تیار کر لیا تھا کہ باپ کے پیچھے پڑ جائیں اور اُس کو مجبور کریں کہ وہ جائیداد اُن کے نام کر دے۔"

"تم نے یہ تو سوچا ہوگا کہ تمہارے بھائی کو کس نے قتل کیا ہے"۔ میں نے کہا۔

"بہت سوچا ہے"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "لیکن کسی وجہ اور ثبوت کے بغیر میں کسی کا نام کیوں لوں!۔۔۔ کسی نے بدلہ لیا ہے اور راستہ روک کر اُس کو مارا ہے۔ وہ کسی شادی پر گیا تھا۔ وہاں کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہو گیا ہوگا"۔

"تم نے مظفر اور خالق کو وہاں پرندوں کا شکار کھیلتے دیکھا تھا"۔ میں نے ریشمی رومال اُس کے آگے پھیلا کر پوچھا۔۔۔ "کیا یہ یا اس رنگ کا ریشمی رومال اُن میں سے کسی کے گلے میں مفلر کی طرح بندھا ہوا تم نے دیکھا تھا؟"

اُس نے کچھ دیر سوچ کر کہا کہ وہ صحیح جواب نہیں دے سکتا۔

اُس زمانے میں شہروں میں بہت کم لوگوں کے پاس گھڑیاں ہوتی تھیں۔ دیہات میں تو گھڑیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ لوگوں نے وقت کے اپنے اپنے اندازے رکھے ہوئے تھے۔ میں اُس وقت کا حساب کرنا چاہتا تھا جس وقت مظفر اور خالق جائے وقوعہ کے قریب موجود

تھے۔ میں نے مقتول کے اس سالے سے وقت کا اندازہ پوچھا۔ ایک وقت پوسٹ مارٹم رپورٹ کا تھا۔ ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ موت کس وقت واقع ہوئی۔ پھر میں نے ان دونوں بھائیوں کے اس بیان پر غور کیا کہ انہوں نے مقتول کو گھوڑی پر آتے دیکھا تھا۔ میں نے ان سے فاصلہ معلوم کیا پھر میں نے اپنے طور پر حساب کیا کہ اس وقت مقتول جائے وقوعہ سے کتنی دور تھا اور گھوڑی کے چلنے کی عام رفتار کتنی ہوتی ہے اور وہ کتنے وقت میں جائے وقوعہ پر پہنچا ہو گا۔

میرا اندازہ کم از کم دس منٹ اور زیادہ سے زیادہ بارہ منٹ تھا مظفر اور خالق کسی راستے پر چل رہے تھے، وہ (دونوں بھائیوں کے بیان کے مطابق) ایک درخت کے نیچے کھڑے تھے چونکہ ان میں سے ایک کے پاس بندوق تھی۔ اس وجہ سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ شکار کھیل رہے ہیں۔ اگر وہ چلتے جا رہے ہوتے تو کہا جا سکتا تھا کہ جب مقتول جائے وقوعہ تک پہنچا تو مظفر اور خالق ان دس بارہ منٹوں میں وہاں سے دور نکل گئے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ وہیں تھے۔ اگر وہ جائے وقوعہ پر نہیں تھے تو اس کے قریب ضرور تھے۔

میرے ذہن میں یہ شک نہیں آیا تھا کہ قاتل یہ ہو سکتے ہیں اگر شک تھا بھی تو وہ بہت کمزور تھا۔ میں دراصل ان سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ انہوں نے وہاں کسی اور کو دیکھا ہو گا۔ میرے قیاس کے مطابق یا کھروں کے مطابق قاتل دو تھے۔ مظفر اور خالق نے گھوڑی کو اس حالت میں دوڑتے دیکھا ہو گا کہ وہ سوار کو اپنے ساتھ گھسیٹ کے لیے جا رہی تھی۔

میں نے مقتول کے اس سالے کو بھی باہر بٹھا دیا اور نمبردار کو بلا کر کہا کہ مظفر اور خالق کو بلا کر باہر بٹھا دے۔

جنازہ چلا گیا تھا اور لوگ شاید واپس بھی آ گئے تھے۔ مظفر اور خالق سے پہلے مقتول کی دونوں بیویوں سے پوچھ گچھ ضروری تھی۔ میں نے پہلے مقتول کی پہلی بیوی کو بلایا۔ دوسری کو بھی اس کے ساتھ بلا کر اس کو یا دونوں میں سے کسی ایک کو بھی میں باہر آدمیوں میں بٹھانا مناسب

نہیں سمجھتا تھا۔

پہلی بیوی میرے سامنے آئی تو مَیں نے اُس کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ معلوم نہیں جوانی میں وہ کیسی تھی۔ پینتالیس اور پچاس سال کے درمیان عمر میں اُس کو ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا جیسی وہ ہو گئی تھی۔ اس کا پیٹ بڑھا ہُوا تھا۔ رنگ جو پہلے ہی گندمی تھا پھیکا پڑ گیا تھا۔ چہرے کے نقش بھی یونہی سے تھے۔ اُس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

مَیں نے اُس کو بٹھا کر افسوس کا اظہار کیا کہ وہ بیوہ ہو گئی ہے۔

"مَیں تو اُس کی زندگی میں ہی بیوہ ہو گئی تھی" ـــــ اُس نے کہا۔ "مر گیا ہے تو کیا ہُوا؟ نہ قیامت آئی ہے نہ آسمان ٹوٹ کر گرا ہے"

"پھر بھی!" ـــــ مَیں نے اُس کا ذہن پڑھنے کے ارادے سے کہا۔ "جو مر جاتا ہے اُس کا افسوس تو ہوتا ہی ہے"

"کوئی افسوس نہیں" ـــــ اُس نے پختہ آواز میں کہا ـــــ "مَیں نے اُس کو کبھی بددُعا تو نہیں دی تھی لیکن خدا نے اُس کو نہیں بخشا۔ ایسی موت اِس جیسے گناہگاروں کو ہی ملتی ہے جیسی اِس کو ملی ہے"

اِس طرح وہ کچھ دیر جلی کٹی باتیں کرتی رہی پھر میں اُس کو اپنی لائن پر لے آیا۔ میں یہ سُراغ لینا چاہتا تھا کہ قاتل اُس کے بھائی ہیں یا اُس کا بیٹا۔ مَیں ایسا سوال سیدھے اور صاف لفظوں میں نہیں پوچھ سکتا تھا۔ مَیں گھما پھرا کر باتیں اور سوال کر رہا تھا لیکن اُس کا ہر جواب مجھ کو مایوس کرتا تھا۔

بات جب مُودی پر آئی تو اُس کی زبان اور تیز ہو گئی۔ مُودی اُس کی سوکن تھی۔ اُس نے مُودی کے خلاف اتنی زیادہ باتیں کیں اور ایسے غصیلے لہجے میں کیں کہ مجھ کو ایک بھی بات سچی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ خالق کے ساتھ مُودی کی دوستی تھی جو مقتول کے ساتھ شادی ہونے سے پہلے کی تھی اور یہ دوستی ابھی تک چل رہی تھی۔

اُس نے یہ بھی بتایا کہ قتل ہونے سے سات آٹھ روز پہلے

مقتول نے مُودی کو بہت گالیاں دیں اور دو تین تھپڑ بھی مارے تھے۔ وجہ یہ بتائی کہ مُودی اپنے گھر گئی ہوئی تھی۔ مقتول نے اُس کو کہیں خالق کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ اُسی وقت مقتول اُس کو اپنے گھر لے آیا تھا۔

"وہ تو میرے گھر بیٹھے پر بھی ڈورے ڈالتی رہتی تھی" ___ مقتول کی پہلی بیوی نے کہا ___ "لیکن میرا بیٹا اُس کو منہ نہیں لگاتا تھا۔"

اِس عورت سے مجھ کو کچھ بھی سُراغ نہ ملا۔ اُس کو بھیج کر دوسری بیوی مُودی کو بُلایا۔ وہ صحیح معنوں میں خوبصورت لڑکی تھی۔ مجھ کو خیال آیا کہ یہ لڑکی اگر خراب ہو گئی تھی تو یہ اِس کا قصور نہیں تھا۔ ذرا تصور میں لائیں کہ یہ لڑکی ابھی جوانی میں داخل ہُوئی تھی اور جس کے ساتھ بیاہی گئی وہ کبھی کا بڑھاپے میں داخل ہو چکا تھا۔

اُس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ مَیں نے اُس کے ساتھ ہمدردی کی باتیں کیں اور خوشی کا اظہار کیا کہ بوڑھے اور وحشی خاوند سے اُس کو جلدی چھٹکارا مل گیا ہے۔ اِس طرح باتیں کر کے میں نے اُس کی گھبراہٹ دُور کی پھر وہ آہستہ آہستہ بولنے لگی۔

"تمہارے ماں باپ نے تم پر یہ ظلم کیوں کیا ہے؟" ___ میں نے پوچھا۔

"ماں باپ نے نہیں" ___ اُس نے کہا ___ "یہ میرے بھائی کی مہربانی ہے۔ میرا باپ تو چھ سال ہُوئے مر گیا تھا۔ ماں ہے اور ایک بھائی ہے۔"

"مظفر؟"

"جی مظفر!" ___ اُس نے جواب دیا ___ "اکیلا بھائی ہے۔"

"کیا اُس نے چوہدری اسحٰق سے کچھ رقم وصول کی تھی؟"

"نہیں جی!" ___ اُس نے جواب دیا ___ "میرے بھائی کو رقم وصول کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بات یہ ہُوئی تھی کہ سر پر باپ نہ ہونے کی وجہ سے مظفر خراب ہو گیا تھا۔ خدا کا دیا بہت ہے مظفر کو جوئے کی لت پڑ گئی تھی۔ ایک روز سُنا کہ چوہدری اسحٰق کے گھر سے سونے کا ہار اور انگوٹھی چوری ہو گئی ہے۔ کچھ دنوں بعد میرا بھائی پکڑا

گیا کہ چوری اُس نے کی ہے۔ میری اور میری ماں کی جو حالت ہوئی وہ شاید آپ نہ سمجھ سکیں۔ ایک یہ بے عزتی کہ میرا بھائی چوری کے الزام میں پکڑا گیا اور دوسرا یہ غم کہ بھائی کو قید کی سزا ہو گی۔ مجھ کو مظفر کے ساتھ بہت محبت ہے.....

"مظفر تھانے سے آگیا اور مجھ کو الگ بٹھا کر کہنے لگا کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے کہ ہار اور انگوٹھی کی چوری کر بیٹھا تھا۔ مجھ کو ڈیڑھ دو سال سزا ہو جائے گی۔ پھر اُس نے کہا کہ چوہدری اسحٰق کہتا ہے کہ اپنی بہن کی شادی میرے ساتھ کر دو تو مقدمہ واپس لے لوں گا.... میں نے یہ سُنا تو میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ میں اس سوچ میں پڑ گئی کہ اپنے آپ کو بچاؤں یا بھائی کو ڈیڑھ دو سال قید سے بچا کر خود عمر قید قبول کر لوں۔ اگر چوہدری اسحٰق کی عمر اتنی زیادہ نہ ہوتی تو میں اُس کو قبول کر لیتی۔ وہ تو میرے باپ کی عمر کا تھا۔"

اس مظلوم لڑکی کا بیان بہت لمبا تھا۔ میں اپنے لفظوں میں مختصر بیان کرتا ہوں۔ بہن نے مظفر کو بُرا بھلا کہا کہ وہ جُوئے کا عادی نہ ہوتا اور اپنے باپ کی طرح شریفوں کی طرح اپنے کام کاج کرتا تو وہ چوری بھی نہ کرتا۔ مُوذی نے مجھ کو بتایا کہ گھر میں روپے پیسے کی کمی نہیں تھی، لیکن ماں پیسے اپنے کنٹرول میں رکھتی اور مظفر کو گِنے چُنے پیسے دیتی تھی۔ مظفر کو عیش و عشرت اور جُوئے کے واسطے پیسوں کی ضرورت ہوتی تھی، اِس وجہ سے اُس نے چوری کی۔

یہ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ جُوا اور نشہ ایسی بُری عادتیں ہیں کہ ان میں سے کسی ایک میں پھنسا ہوا آدمی چوری چکاری پر اُتر آتا ہے۔ آپ نے اکثر سُنا ہو گا کہ جُوئے باز نے اپنی ماں یا بہن کا زیور چوری کر لیا اور یہ خبر تو اخباروں میں آئے دن چھپتی ہے کہ چرس، افیم یا ہیروئن کے نشئی نے گھر سے پیسے نہ ملنے کی وجہ سے ماں کو یا باپ کو قتل کر دیا۔ یہ ہمارا تجربہ ہے کہ چور اور ڈاکو پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ جُوئے باز پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔

یہی حال مظفر کا تھا۔ اُس نے چوری کی، پکڑا گیا اور چوہدری اسحٰق نے یہ شرط اُس کے آگے رکھ دی کہ اپنی بہن دے دو اور قید سے بچ جاؤ۔ مُودی نے ماں کو بتایا۔ ماں نے بیٹے کو گالی گلوچ کی اور چوہدری اسحٰق کے پاس گئی۔

"میں تم لوگوں کو مجبور تو نہیں کر رہا میری بہن!" ــــ اسحٰق نے کہا ــــ "تھانے میں چوری کا مال بھی پہنچ گیا ہے، ثبوت اور شہادت بھی موجود ہے۔ یہ تو میں نے تھانے دار کا ہاتھ روک لیا ہے ورنہ تمہارا بیٹا گھر نہ آتا حوالات میں بند ہوتا۔ قید سے بچنے کی دوسری صورت یہ ہے کہ اپنے بیٹے کو کہیں بھگا دو۔ وہ گھر ہی نہ آئے لیکن پولیس تم دونوں ماں بیٹی کو ہر روز آ کر تنگ کرے گی کہ ملزم کو حاضر کرو"

یہ ایسا مسئلہ تھا جو بیوہ ماں برادری اور محلے کے معززین کے آگے نہیں رکھ سکتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ ابھی کسی کو پتہ نہیں لگا تھا کہ چوہدری اسحٰق کے زیور کا چور مظفر ہے۔ چوہدری اسحٰق تو مظفر پر دباؤ ڈال ہی رہا تھا، دراصل زیادہ دباؤ مظفر اپنی ماں اور بہن پر ڈال رہا تھا کہ وہ اسحٰق کی شرط مان لیں۔ مظفر نے اُن کے گھر سے چلے جانے کی دھمکیاں دیں۔ گھر سے کھانا کھانا چھوڑ دیا اور ایسی کئی اور حرکتیں کیں جن سے ماں اور بہن پریشان ہو گئیں۔

"باپ کے بعد یہی ایک بھائی رہ گیا تھا" ــــ مودی نے کہا ــــ "بھائی کی محبت الگ تھی۔ میں نے بھائی کی خاطر اپنے آپ کو قربان کر دیا۔"

اس طرح یہ نوجوان لڑکی پچاس سال عمر کے ایسے آدمی کے ساتھ بیاہی گئی جس کا ایک بیٹا اُس لڑکی کا ہم عمر تھا۔

❦

"آپ مجھ سے کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟" ــــ مُودی نے مجھ سے پوچھا ــــ "میرا دل جلا ہوا ہے اس وجہ سے بولتی جا رہی ہوں۔"

"تمہارا خاوند بدبخت قتل ہو گیا ہے تو اس کے قاتل کو پکڑنا ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "تم ڈرو نہیں، تم پر کوئی الزام نہیں نہ تم پر کوئی شک

ہے۔ اسحٰق کے گھر کے حالات معلوم کرنے ہیں۔ میں تم سے جو پوچھتا جاؤں وہ بتاتی جاؤ۔"

"ایک بات بتاؤں؟" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "ماتم کی وجہ سے سارے محلے اور ان کے گاؤں کی عورتیں اکٹھی ہو گئی ہیں۔ جن جن عورتوں کو پتہ لگا ہے کہ چوہدری گھوڑی سے گرا نہیں بلکہ اُس کو قتل کر کے گھوڑی کے ساتھ باندھا گیا تھا وہ سب کہتی ہیں کہ یہ چوہدری کے سالوں کا کام ہے۔ وہ اپنے سسرال کے گاؤں کی طرف سے ہی آ رہا تھا۔"

"تمہارا اپنا کیا شک ہے؟"

"بالکل وہی جو لوگ کہتے ہیں" ـــــ مُودی نے جواب دیا ـــــ "چوہدری نے ان کی بہن کو مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا تھا۔ انہوں نے بدلہ لے لیا ہے۔"

"مجھ کو تو چوہدری کے بیٹے اصغر پر بھی شک ہے" ـــــ میں نے کہا۔

"نہیں، نہیں" ـــــ مُودی نے بے اختیار اور بے تاب ہو کر کہا ـــــ "وہ ایسا نہیں۔"

جس بے اختیار انداز سے اُس نے اصغر کی وکالت کی اور جس طرح اُس کے چہرے کا رنگ بدلا، اس سے لازمی طور پر مجھ کو شک ہونا تھا کہ اُس کا اصغر کے ساتھ در پردہ تعلق تھا۔ وہ مُودی کی عمر کا خوبرو نوجوان تھا۔

"وہ تو سنا ہے باپ کے گلے پڑ گیا تھا" ـــــ میں نے کہا ـــــ "ماں نے اُس کو باپ کا دشمن بنایا ہوا تھا۔"

"ماں نے اُس کو میرا بھی دشمن بنایا ہوا تھا" ـــــ مُودی نے کہا ـــــ "لیکن وہ میرے پاس آتا تھا، بیٹھتا تھا اور کبھی کبھی رو بھی پڑتا تھا۔ باپ کے گلے تو وہ پڑ گیا تھا لیکن آپ نے اُس کو باپ کی میّت پر دھاڑیں مار مار کر روتے نہیں دیکھا۔ وہ میّت کے پاؤں پر سر رکھ کر بار بار کہتا تھا ـــــ 'ابّو مجھ کو معاف کر دینا... ابّو مجھ کو بخش دینا'

ـــ میرے پاس بیٹھا تھا تو کہتا تھا کہ ابو بھی ٹھیک نہیں اور میری ماں بھی ٹھیک نہیں ..... میں اُس کو بہلانے کی کوشش کرتی تھی۔"

"اور تمہاری سوکن بُرا مناتی تھی" ـــ میں نے کہا ـــ "وہ لوگوں کو بھی کہتی ہو گی کہ تم اُس کے بیٹے کو خراب کر رہی ہو۔"

"لوگوں کو نہیں جی!" ـــ مُودی نے کہا ـــ "وہ میرے منہ پر کہتی تھی۔ مجھ کو دیکھتے ہی اُس کا پارہ چڑھ جاتا تھا اور وہ کوئی نہ کوئی بات پیدا کر کے واہی تباہی بکنے لگتی تھی۔"

میں نے اُستادی طریقے سے اس سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اپنے خاوند کے جوان بیٹے اصغر کے ساتھ اُس کے تعلقات کس قسم کے تھے لیکن وہ یہی کہتی رہی کہ اصغر اس کے پاس بیٹھ کر گھر کے حالات پر روتا تھا اور وہ اُس کو تسلّی دلاسہ دیا کرتی تھی۔ میں اس وجہ سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ مُودی اور اصغر کے تعلقات بھی قتل کا باعث ہو سکتے تھے۔

"تمہارے خاوند نے تمہیں تھپڑ کیوں مارے تھے؟"

"کب؟" ـــ اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں" ـــ میں نے کہا ـــ "مُودی! میں نے تمہیں پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں جو کچھ بھی پوچھوں وہ بالکل صحیح بتا دو۔ تم شاید سمجھی نہیں کہ تم کتنے بڑے خطرے میں آ گئی ہو۔ یہ لوگ آپس میں رشتہ دار ہیں اور تم باہر کی لڑکی ہو۔ وہ صرف چوہدری اسحٰق تھا جس نے تمہیں قبول کیا تھا۔ وہ مر گیا ہے۔ پیچھے جو رہ گئے ہیں وہ سب تمہارے دُشمن ہیں۔ اب اُن کی دُشمنی پہلے سے زیادہ خطرناک ہو گئی ہے۔ یہ سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم اپنے خاوند کی جائیداد کی حصہ دار ہو۔ یہ لوگ جھوٹے سچے گواہ لا کر ثابت کر دیں گے کہ اپنے خاوند کو تم نے مروایا ہے پھر میں مجبور ہو جاؤں گا۔ مجھ سے مت ڈرو۔ میں تمہیں پوری حفاظت دوں گا لیکن مجھ سے کچھ بھی نہ چھپاؤ۔"

"کچھ نہیں چھپاؤں گی" ـــ اُس نے کہا۔

"پھر بتاؤ تمہیں خاوند نے کیوں مارا تھا؟" ــــ میں نے پوچھا اور خود ہی جواب دے دیا ــــ "تم ابھی تک خالق سے ملتی ہو اور تمہارے خاوند کو پتہ لگ گیا تھا۔۔۔۔ وہ تمہارے بھائی مظفر کا دوست ہے نا!"

"جی!" ــــ اُس نے کہا ــــ "یہ ٹھیک ہے۔"

میرے دو تین سوالوں کے بعد وہ مان گئی کہ وہ خالق کو چاہتی تھی اور اُس کی شادی خالق کے ساتھ ہو جاتی لیکن حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ اسحٰق کے ساتھ شادی ہو گئی۔ اُس نے یہ بھی مان لیا کہ وہ خالق سے اب بھی ملتی ملاتی تھی۔

"چوہدری اسحٰق تو تمہیں سر آنکھوں پر بٹھاتا ہو گا" ــــ میں نے کہا۔

"وہ میرا سر اپنے قدموں میں رکھتا تھا" ــــ اُس نے کہا ــــ "مجھے کہ وہ خریدی ہوئی لونڈی سمجھتا تھا۔ اُس کے پاس پیار تو تھا ہی نہیں۔ ہر وقت رُعب میں رہتا اور ہر بات رُعب سے کرتا تھا" ــــ اُس کے آنسو نکل آئے اور کہنے لگی ــــ "میں نے تو سوچ لیا تھا کہ خودکشی کر لوں گی۔"

"خالق نے تمہیں کبھی نہیں کہا تھا کہ آؤ کہیں بھاگ چلیں؟"

"کئی بار کہا تھا" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "میں نہیں مانتی تھی میں کہتی تھی کہ بھاگ تو چلوں لیکن طلاق کے بغیر شادی تو ہو نہیں سکتی پھر ہم چوروں کی طرح کہاں چھپتے پھریں گے؟"

اس لڑکی کے ساتھ بہت باتیں ہوئیں۔ کبھی مجھ کو شک ہوتا کہ قتل کا باعث یہی لڑکی ہے۔ جن آدمیوں پر مجھ کو شک ہوتا تھا میں ان میں سے ہر ایک پر غور کرتا تو میرا دماغ اُلجھ جاتا تھا۔ ایسے ایک شک کی بناء پر میں نے ریشمی رومال مودی کے آگے رکھ دیا۔ ہم دونوں کے درمیان چھوٹی سی ایک میز پڑی تھی۔ میں نے رومال پھیلایا نہیں تھا۔ ویسے ہی میز پر رکھ دیا تھا۔

"کیا تمہاری سوکن کے بھائی اسحٰق کے گھر آتے رہتے تھے؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"ان میں سے کوئی نہ کوئی کبھی آ ہی جاتا تھا" ــــ اُس نے جواب دیا۔
"کیا ان میں سے کوئی اس قسم کا رومال اپنے گلے میں ڈالتا تھا؟"
"شاید نہیں" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "میں نے کبھی خیال سے نہیں دیکھا۔ ان کے ساتھ میں نے کبھی بات نہیں کی تھی۔ ان کو دیکھ کر میں کمرے میں چلی جاتی تھی"۔
"چوہدری اسحٰق کا ہو گا؟"
"نہیں" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "اس نے گلے میں رومال کبھی نہیں ڈالا تھا..... کیا یہ وہ رومال ہے جو چوہدری کے گلے میں پڑا ہوا تھا؟"
"تمہیں کس نے بتایا ہے؟"
"تین چار عورتوں نے مجھ کو بتایا تھا" ــــ اُس نے جواب دیا۔
یہ بڑی غلط بات ہوئی تھی۔ اس رومال کی بابت کسی کو پتہ نہیں لگنا چاہیے تھا مگر ایسی چیزیں چھپائی نہیں جا سکتیں۔ میں نے تماشائیوں کے سامنے لاش کے گلے سے رومال کھولا تھا۔

"اصغر تو مفلر کی طرح یہ رومال اپنے گلے میں ضرور باندھتا ہو گا" ــــ میں نے کہا۔
"نہیں" ــــ اُس نے جواب دیا۔
"تمہارے بھائی نے مفلر کبھی نہیں باندھا؟"
"باندھتا ہے" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "لیکن اس رنگ کا نہیں"۔
اُس نے رومال کو کھولنا شروع کر دیا۔ اس کو پھیلایا نہیں بلکہ اس کے کونے اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ وہ کونہ سامنے آ گیا جس پر دل اور تیر بنا ہوا تھا۔ میں مُودی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے کچی پنسل کا بنا ہوا نشان دیکھا تو اتنی تیزی سے اس کونے کو اُلٹا کر دیا جیسے دل میں سے جو تیر گزرا ہوا تھا وہ اس کے ہاتھ کو چُبھ گیا ہو۔
"خالق بھی مفلر باندھتا ہو گا!" ــــ میں نے کہا

"نہیں نہیں" ۔۔۔ اُس نے گھبراہٹ میں کہا ۔۔۔ "اُس نے ایسا مفلر کبھی نہیں باندھا"

مجھ کو جن جن پر شک تھا اُن سب کا میں نے پوچھا تھا کہ وہ رومال گلے میں ڈالتا ہے تو مُودی نے بڑے آرام سے جواب دیا تھا۔ ہر ایک کی بابت اُس نے اطمینان سے بتایا تھا لیکن خالق کی بابت پُوچھا تو مُودی اتنی زیادہ گھبرا گئی کہ وہ گھبراہٹ کو چھپا نہ سکی۔ اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اُس نے اس طرح "نہیں نہیں" کہا جیسے میں نے اُس کو یہ کہہ دیا تھا کہ اپنے خاوند کو تم نے قتل کیا ہے۔

"کیا یہی رومال لاش کے گلے میں تھا؟" ۔۔۔ مُودی نے پوچھا۔

"نہیں مُودی نہیں" ۔۔۔ میں نے جھوٹ بولا ۔۔۔ "یہ رومال لاش کے گلے میں نہیں تھا۔ وہ سفید تھا رنگدار نہیں تھا"

"پھر یہ رومال آپ کے پاس کس طرح آیا ہے؟" ۔۔۔ اس نے پوچھا۔

وہ گھر کی چار دیواری میں بند رہنے والی لڑکی تھی اور ناتجربہ کار عمر کی تھی۔ اُس میں چالاکی تھی ہی نہیں۔ مجھ کو اُس نے پکے شک میں ڈال دیا تھا۔ میں نے اس کے سوال کا جواب یہ دیا کہ یہ رومال مجھ کو کھیتوں میں پڑا ملا تھا۔ اس کے بعد میں نے مُودی سے کوئی اور سوال نہ کیا۔ اس کو کہا کہ وہ اپنے گھر چلی جائے اور کسی کو نہ بتائے کہ میرے ساتھ اُس کی کیا باتیں ہوئی ہیں۔

وہ چلی گئی تو میں نے نمبردار کو بلا کر پوچھا کہ مظفر کے علاوہ خالق کے دوست کون کون ہیں۔ یہ کہہ کر مجھ کو ایک اور خیال آ گیا۔

"اُس کے دوستوں کے علاوہ محلے کے تین چار نوجوان لڑکوں کو بلا لو" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "ان سب کو جگا کر لے آؤ"

وقت آدھی رات کے قریب تھا۔ نمبردار نے مجھ کو بتایا کہ مظفر اور خالق شام سے باہر بیٹھے ہیں۔ میں نے اُن کو کہا کہ اُن کو بیٹھا رہنے دو۔

آدھے گھنٹے میں سات لڑکے جن کی عمریں سولہ سے اکیس بائیس سال تک تھیں، آ گئے۔ مجھ کو افسوس ہونے لگا کہ میں نے رومال کی شناخت کا یہ طریقہ پہلے ہی کیوں نہیں آزمایا۔ میں نے ہر ایک لڑکے کو اکیلے اکیلے

اندر بلایا اور پوچھا کہ یہ رومال کس کا ہے۔

چھ نے جواب دیا کہ وہ نہیں جانتے۔ میں نے ان سب سے پوچھا، کیا خالق اس قسم کا مفلر نہیں باندھتا یا یہ رومال گلے میں نہیں ڈالتا؟ ان میں سے چار نے جواب دیا کہ خالق اس رنگ اور اس ڈیزائن کا مفلر کبھی کبھی باندھتا ہے۔

ساتواں لڑکا اندر آیا تو اس کے ساتھ نمبردار بھی تھا۔

"جناب!" — نمبردار نے کہا — "یہ میرا بیٹا ہے.... اچھی طرح سن لے!" — اس نے اپنے بیٹے کو کہا — "انسپکٹر صاحب جو پوچھیں وہ بالکل ٹھیک بتانا!"

نمبردار اس کو میرے پاس چھوڑ کر جانے لگا تو میں نے اس کو روک لیا۔

"کیا تم اس رومال کو پہچانتے ہو؟" — میں نے نمبردار کے بیٹے سے پوچھا اور رومال کا وہ کونا اس کے آگے کر دیا جس پر دل اور تیر بنا ہوا تھا۔

اس نے رومال کو دیکھا پھر اپنے باپ کی طرف دیکھا جیسے اس کو کچھ کہنا چاہتا ہو۔

"تم پہچانتے ہو" — میں نے کہا۔

اس نے ڈھیلی سی زبان میں کہا "نہیں" اور پھر اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ اس لڑکے کی عمر سترہ سال کے لگ بھگ تھی۔

"بولتے کیوں نہیں؟" — میں نے پوچھا — "کیا یہ تمہارے کسی دوست کا ہے؟"

"اگر تم رومال کو پہچانتے ہو تو بتا دو" — نمبردار نے اس کو کہا۔

لڑکے نے میری طرف دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ جواب نہیں دینا چاہتا۔ میں ہنس پڑا۔

"کیا خالق تمہارا دوست ہے؟" — میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"جی!" — اس نے آہستہ سے کہا۔

"شاباش!" — میں نے کہا — "میں خوش ہوں کہ تم دوستی کا حق

ادا کر رہے ہو لیکن یہ تو مجھ کو پتہ لگ ہی گیا ہے کہ یہ رومال خالق کا ہے۔ مَیں چاہتا تھا کہ اس کی تصدیق تم کر دیتے اس سے تمہارے والد صاحب کی عزت افزائی ہو جاتی کہ نمبردار کے بیٹے نے پولیس کی مدد کی ہے"
"بتا دے، بتا دے!" — نمبردار نے اپنے بیٹے کو کہا — "دیکھ انسپکٹر صاحب ہماری کتنی عزت کر رہے ہیں!"
میں اس لڑکے سے بات کھلوانے کی غرض سے ذرا نرم پڑ گیا تھا اور یہ ظاہر کیا تھا کہ میں اس کا محتاج ہوں۔ وہ نہ بولتا اور پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا تو میں اُسے تھانے لے جاتا اور اس کا سارا خاندان بول پڑتا۔
"یہ رومال خالق کا ہے" — لڑکے نے کہا۔
"اس شہر میں ایسے کئی رومال ہوں گے" — میں نے کہا — "تم یقین کے ساتھ کس وجہ سے کہہ رہے ہو...؟"
"اس وجہ سے!" — اس نے میرا سوال ادھورا چھوڑ کر انگلی رومال کے کونے پر رکھی اور کہا — "یہ محبت کی نشانی ہے۔ خالق نے مجھ کو یہ رومال دکھایا تھا اور اس نے کہا تھا کہ یہ ایک لڑکی نے تحفہ دیا ہے لیکن اس نے لڑکی کا نام نہیں بتایا۔ میں نے بہت پوچھا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ پاک محبت کا تحفہ ہے اس واسطے میں اس لڑکی کو بدنام نہیں کرنا چاہتا۔"

❦

میں نے وہاں سے اڈہ اُٹھایا اور تھانے چلا گیا۔ اپنے عملے کے آدمیوں کے علاوہ جن آدمیوں کو میں ساتھ لایا، ان میں ایک تو مُودی کا بھائی مظفر تھا اور دوسرا خالق۔ نمبردار بھی ساتھ تھا لیکن اُس کے بیٹے کو میں اس وجہ سے ساتھ نہیں لایا تھا کہ اُس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں یہ ظاہر نہ ہونے دوں کہ اُس نے مجھ کو بتایا ہے کہ یہ رومال خالق کا ہے۔ مجھ کو اس ضمن میں گواہ کی ضرورت ہی نہیں تھی۔
مجھ کو وہ وقت اچھی طرح یاد ہے جب میں تھانے پہنچا تھا۔

تھوڑی دیر بعد فجر کی اذان کی آواز سنائی دی تھی۔ میرے دماغ کا اور جسم کا حال بہت بُرا ہو گیا تھا۔ دو راتیں جاگتے گزر گئی تھیں۔ نہ دن کو آرام کیا نہ رات کو۔ میں ہیڈ کانسٹیبل مُرشد علی کو یہ کہہ کر گھر چلا گیا کہ مظفر اور خالق کے کھُرے چیک کرے اور میں دو گھنٹوں بعد آؤں گا۔

دو گھنٹے سو کر دماغ صحیح ہو گیا۔ میں تھانے آیا اور ہیڈ کانسٹیبل نے بتایا کہ جائے واردات پر پائے جانے والے کھُرے انہی کے ہیں۔ دونوں کم عقل تھے۔ میں نے جب اُن کو بلایا تو دونوں اچھے کپڑے اور اچھے جُوتے پہن کر آئے تھے۔ ایک نے تسموں والے شوز پہنے ہوئے تھے اور دوسرے نے پشاوری چپل پہنی ہوئی تھی۔ یہی پہن کر وہ جائے واردات تک گئے تھے۔

میں نے خالق کو اپنے دفتر میں بلا کر بٹھایا۔

"خالق بھائی!" ــــ میں نے پوچھا ــــ "سچ بولو گے؟"

اُس نے جواب دیا لیکن لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر اُس کے منہ سے نکلے اور اس کے درمیان اُس کو ہچکی سی آئی۔ یہ اُس کی گھبراہٹ کی انتہا تھی۔ میں نے اپنا سوال دوہرایا تو اُس نے دائیں بائیں سر ہلایا جس کا مطلب تھا، نہیں۔

"تم نے ایک جھوٹ بول لیا ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "اب ایک اور جھوٹ بولو پھر میں تمہیں تماشہ دکھاؤں گا" ــــ میں نے ریشمی رومال کے کونے پر بنے ہوئے دل اور تیر پر انگلی رکھ کر کہا ــــ "یہ کس لڑکی نے بنایا تھا؟ .... کہہ دو مجھے معلوم نہیں۔ پھر میں اُس لڑکی کو یہاں بلا کر تمہارے سامنے کھڑا کر دوں گا .... فوراً بولو .... وہ لڑکی رات کو میرے پاس رہی ہے جب میں تمہارے محلے میں تھا۔"

یہ بلاشک و شبہ مُودی کا دیا ہُوا رومال تھا۔ میں پہلے سُنا چکا ہوں کہ رات کو مُودی نے رومال پر محبت کا نشان دیکھا تھا اور اس کا جو ردِ عمل تھا اُس کو وہ چھُپا نہیں سکی تھی۔

"ہیڈ کانسٹیبل نے تمہارا کھُرا دیکھا ہے نا!" ــــ میں نے خالق کو کہا۔

خالق کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ اُس کی آنکھیں بھی سفید اور ہونٹ بھی سفید ہو گئے تھے۔ چہرے کا رنگ لاش کی طرح ہو گیا تھا۔ وہ نہ زبان سے جواب دیتا تھا نہ سر ہلاتا تھا۔ وہ بیہوش ہونے والا تھا۔ میں نے اُس کے واسطے پانی منگوایا اور اُسے اُس کو پلایا۔

"اب مرد بنو" ــــ میں نے کہا ــــ "تم نے مردوں والا کام کیا ہے۔ میرے سامنے بھی مرد بنے رہو۔ میں تمہاری مدد کروں گا" ــــ اُس کو حوصلہ دینے کی غرض سے میں نے کہا ــــ "تم نے اُس کو لوٹا نہیں۔ اُس کے گھر میں ڈکیتی کی واردات نہیں کی۔ میں جانتا ہوں تم نے اس کو کیوں قتل کیا ہے۔ ہوش میں آؤ اور بولو"

وہ کچھ بھی نہ بولا۔

"خالق!" ــــ میں نے کہا ــــ "اب جھوٹ اور انکار نہیں چلے گا۔ میں تم کو خواہ مخواہ یہاں نہیں لے آیا۔ مودی بے چاری نادان ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں چھپا سکی۔ تم کو اور مظفر کو وہاں دیکھا گیا تھا جہاں تم نے چوہدری اسحٰق کی گھوڑی روکی تھی۔ ... رومال اُس کے گلے میں کیوں رہنے دیا تھا؟"

اُس کے سر کو ذرا سی حرکت ہوئی۔ میں اس حرکت کو نہ سمجھ سکا۔ وہ نہ انکار کرنے کی جرأت کر رہا تھا نہ اقبال کی۔ میں پہلے تو آرام آرام سے اور نرمی سے اس کی حوصلہ افزائی کرتا رہا لیکن اُس کو جگانے کی ضرورت بھی۔ میں مزید انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ میں اُٹھا اور اُس کے قریب جا کر اُس کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا۔ اِس تھپڑ سے اُس کے جسم میں رُکا ہوا خون چل پڑا۔ اس کے چہرے پر سُرخی آ گئی اور وہ بیدار ہو گیا۔

"اب میں تمہیں اُلٹا لٹکاؤں گا۔"

تھوڑی اور کوشش کے بعد وہ بول پڑا۔ میں ایسے اُس کو حوصلہ دیتا رہا جیسے وہ اپنی غزلیں سُنا رہا ہو اور میں داد دے رہا ہوں۔ اُس کی زبان چل پڑی۔ میں نے قتل کی کہانی نہیں سُنی تھی۔ میں نے مقدمہ بھی تیار کرنا تھا، اس غرض سے میں اُس سے سوال پوچھتا اور اس کے جواب لکھتا جاتا تھا۔ اس طرح اُس کا بیان بہت لمبا ہو گیا تھا۔

بات صرف یہ تھی کہ وہ مظفر کا دوست تھا۔ مظفر کی ماں اس کو اپنا بیٹا سمجھتی تھی۔ مظفر کو معلوم نہیں تھا کہ اُس کی بہن اور خالق میں دلی محبت چل رہی ہے۔ مظفر کی ماں کو معلوم تھا اور ماں کو یہ اعتبار بھی تھا کہ ان کی محبت میں خرابی والی کوئی بات نہیں۔ خالد اور مظفر کی ماؤں نے رشتہ طے کر لیا تھا لیکن باقاعدہ بات نہیں ہوئی تھی۔ خالق کی ماں نے ابھی تیاری کرنی تھی۔ مظفر کو یہ معلوم تھا کہ اُس کی بہن خالق کے ساتھ بیاہی جائے گی۔ مودی نے خالق کو یہ رومال دیا تھا اور اس کے کونے پر کچی پنسل کو تھوک لگا لگا کر دل اور اس میں سے گزرتا ہوا تیر بنایا تھا۔

خالق نے مجھ کو بتایا کہ مظفر کو جوئے بازی کا ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ اُس کے کہنے سے بھی منع نہیں ہوتا تھا۔ خالق نے یہ بھی بتایا کہ وہ کہاں جا کر جوا کھیلتا تھا۔ خالق کو یہ پتہ نہیں لگا کہ مظفر نے چوہدری اسحٰق کے گھر سے زیور چوری کیا ہے۔ اُس کو اُس وقت پتہ لگا جب مظفر کو تھانے بلایا گیا تھا۔ خالق اُس کو بے گناہ سمجھتا تھا لیکن تھانے سے واپس آ کر اس نے خالق کو صحیح بات بتا دی کہ اُس نے زیور کی یہ دونوں چیزیں چوری کی تھیں اور دونوں ہار دیں۔ جیتنے والا بھی اناڑی اور بیوقوف نکلا۔ وہ تین چار دنوں کے بعد ہار اور انگوٹھی ایک سنار کے پاس لے گیا۔ سنار نے چیزیں رکھ لیں اور تھانے اطلاع دے دی۔ بیچنے والا پکڑا گیا۔ اُس نے کہا کہ یہ چیزیں مظفر سے جیتی تھیں۔ اُس نے چار پانچ گواہ پیش کر دیئے۔

مظفر پکڑا گیا لیکن چوہدری اسحٰق نے مظفر کو اس شرط پر بچا لیا کہ وہ اپنی بہن کو اُس کے ساتھ بیاہ دے۔ مظفر نے جب یہ شرط خالق کو بتائی تو خالق کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ خالق نے مودی کو کہیں مل کر کہا کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ چلے لیکن مودی نہیں مانتی تھی۔

"کہیں نکاح پڑھوا کر واپس آ جائیں گے" ——— خالق نے مودی کو کہا۔ "پھر ہم پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکے گا۔" ———

"میں تو یہاں رہ کر چوہدری اسحٰق کے ساتھ شادی کرنے سے انکار

کرسکتی ہوں" ـــ مُودی نے کہا ـــ "لیکن مَیں تو بھائی کو بچانا چاہتی ہوں۔ وہ سیدھا جیل میں چلا جائے گا۔"

"کیا تم میں اتنی جرأت تھی کہ مُودی کو بھگا لے جاتے؟" ـــ میں نے خالق سے پوچھا ـــ "اور پھر تم نکاح کرکے واپس آجاتے اور اعتراض کرنے والوں کا مقابلہ کر لیتے؟"

"جرأت کی بات کرتے ہیں؟" ـــ اُس نے کہا ـــ "کیا قتل بزدل کیا کرتے ہیں؟ آپ میرے بارے میں محلے کے کسی بھی آدمی سے پوچھ لیں کہ مجھ میں کتنی جرأت ہے۔ ... چوہدری مرگیا ہے۔ وہ زندہ ہوتا تو آپ اُس سے پوچھتے۔ اب تو گواہی دینے والا کوئی نہیں رہا۔ میں مُودی کے ساتھ اُس کی شادی سے پہلے اُس کو ملا تھا اور اُس کو کہا تھا کہ چوہدری صاحب مظفر اور مُودی کے سر پر ان کا باپ نہیں ہے۔ آپ ان پر ظلم نہ کریں۔ چوہدری نے مجھ کو ڈانٹ دیا تھا۔ مَیں نے اُس کو کہا تھا کہ چوہدری! تمہاری زندگی کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں۔ ... اور اب پانچ چھ دنوں کی بات ہے، چوہدری نے مُودی کو اس قصور پر مارا تھا کہ وہ مجھ کو ملتی ہے۔ ...

"چوہدری کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ اُس سے لوگ ڈرتے تھے۔ اُس نے اپنے مزارعوں میں دو بدمعاش رکھے ہوئے ہیں۔ مَیں نے چوہدری کو راستے میں روک کر کہا ـــ 'چوہدری! تم نے اپنی موت کو آواز دے ہی لی ہے' ـــ اُس نے بدمعاشوں کو میرے خلاف استعمال نہ کیا۔ اُس کی بجائے میرے اَبّو اور بڑے بھائی کو کہا کہ اپنے لڑکے کو سنبھال کر رکھو۔ میرا بڑا بھائی اُس طرح سر اٹھا کر دھمکی دینے والے کا سر بچا کرنا جانتا ہے۔ اُس نے چوہدری کو جواب دیا کہ مَیں تمہارا رعب نہیں مانوں گا۔"

یہ بعد کی باتیں ہیں۔ مُودی کی شادی چوہدری اسحٰق مقتول کے ساتھ ہوگئی۔ خالق مظفر سے ناراض ہوگیا۔ مظفر پر مُودی کی شادی اور خالق کی ناراضگی کا یہ اثر ہوا کہ وہ ہر وقت پریشان رہنے لگا۔ اُس نے جوا

چھوڑ دیا۔ مُودی جب کبھی اپنی ماں کے پاس آتی تھی تو خالق کے گھر بھی جاتی تھی اور خالق کی بھابی ایسا بندوبست کر دیتی تھی کہ خالق اور مُودی کچھ دیر اکیلے اکٹھے بیٹھ جاتے تھے۔ مُودی خالق کو بتاتی رہتی تھی کہ چوہدری اسحٰق اُس کو کتنا پریشان رکھتا ہے اور وہ جہنم میں جل رہی ہے۔

مُودی کو روتا دیکھ دیکھ کر اور اس کی فریادیں سُن سُن کر خالق کے دل میں چوہدری اسحٰق کی نفرت بھرتی گئی اور یہ نفرت انتقام کی صورت اختیار کر گئی۔ خالق نے مجھ کو بتایا کہ مُودی نے مظفر کے ساتھ بول چال بند کر دی ہے۔ وہ اپنی ماں کے پاس آتی تھی۔ مظفر اُس کے ساتھ بات کرتا تھا تو وہ اُس کی طرف دیکھتی ہی نہیں تھی۔

ایک روز قتل سے چھ روز پہلے، مظفر خالق سے ملا۔ خالق نے بھی مظفر کے ساتھ بول چال بند کی ہوئی تھی۔ تقریباً ایک سال ہو گیا تھا۔ مظفر خالق کے پاس جا کر بہت رویا۔

"میں اپنی بہن کی ناراضگی اور زیادہ برداشت نہیں کر سکتا" —— اُس نے خالق کو کہا —— "میری ماں کے دل میں بھی میری محبت نہیں رہی۔ چوہدری اسحٰق نے میری بہن کی زندگی دوزخ جیسی بنائی ہوئی ہے۔ کل اُس نے ہمارے گھر آ کر مُودی کو مارا ہے اور اُس کو ساتھ لے گیا ہے.... خالق میری مدد کرو۔"

"کیا کرنا چاہتے ہو؟" —— خالق نے اس سے پوچھا —— "مُودی کو چوہدری سے کس طرح آزاد کراؤ گے؟"

"تم کچھ بتاؤ" —— مظفر نے کہا —— "یہ میرا گناہ ہے۔ تم کہو تو میں خودکشی کر لوں۔"

خالق تو پہلے ہی بھرا پڑا تھا۔ اُس نے مظفر کو قائل کر لیا کہ چوہدری اسحٰق کو قتل کر دیا جائے۔ دونوں ایک بار پھر دوست بن گئے۔ وہ دو دن قتل کے منصوبے سوچتے رہے۔ خالق نے ایک بوڑھے آدمی سے کسی گھوڑ سوار کی موت کا پرانا واقعہ سُنا تھا۔ اُس کا گھوڑا بدک گیا تھا۔ وہ گرا تو اُس کا پاؤں رکاب میں پھنس گیا۔ گھوڑے نے اُس

کو گھسیٹ گھسیٹ کر مار ڈالا اور اُس کو اپنے گھر لے آیا۔

خالق نے قتل کا یہ طریقہ سوچ لیا۔ چوہدری اسحٰق کھیتوں میں جاتا تو بھی گھوڑی پر جاتا تھا۔ خالق نے مظفر کو یہ طریقہ بتایا تو مظفر نے اپنا دماغ لڑا کر اس طریقے کو ذرا بہتر بنا لیا۔ دونوں بہت خوش تھے کہ انہوں نے قتل کا ایسا طریقہ سوچا ہے جس کو کوئی قتل کی واردات سمجھ ہی نہیں سکے گا۔

جو ہونا تھا اس کا سبب یہ بنا کہ مُودی دو دنوں کے واسطے اپنی ماں کے پاس آئی اور خالق کے گھر بھی گئی۔ اُس نے خالق کو بتایا کہ وہ کل شام تک اپنے گھر میں رہے گی اور چوہدری اسحٰق فلاں گاؤں میں اپنے کسی دوست کی شادی پر چلا گیا ہے۔ وہ کل بعد دوپہر واپس آئے گا۔ مودی نے یہ بھی بتایا کہ چوہدری اپنی گھوڑی پر گیا ہے۔

”وہ گھر واپس نہیں آئے گا“ —— خالق نے کہا۔

”اللہ کرے نہ ہی آئے“ —— مودی نے کہا۔

خالق نے تو یہ بات ارادے سے کہی تھی، لیکن مُودی نے ان لفظوں کو خالق کی بددعا سمجھ کر خود بھی بددعا دے دی۔ خالق نے اُس کو اپنے ارادے سے آگاہ نہیں کیا تھا۔

اگلے روز دوپہر کا کھانا کھا کر مظفر نے اپنی بندوق نکالی اور ماں کو یہ بتایا کہ وہ خالق کے ساتھ شکار کو جا رہا ہے۔ چلا گیا۔ دونوں اُس گاؤں کے راستے پر گئے اور گھات کے واسطے ان کو وہ جگہ موزوں لگی جو بعد میں جائے وقوعہ بنی۔ دونوں نے دو تین کارتوس فائر کیے اور پرندے مارے۔ دونوں تین بار گھاٹی پر گئے۔ آخری بار اُس کو چوہدری اسحٰق گھوڑی پر آتا دکھائی دیا۔

دونوں گھات میں چھپ گئے۔ گھوڑی گھاٹی سے اُتری تو دونوں باہر نکلے۔ بندوق خالق کے ہاتھ میں تھی۔ وہ بندوق مقتول کی طرف کر کے گھوڑی کے راستے میں کھڑا ہو گیا۔ مظفر نے گھوڑی کی باگیں منہ کے قریب سے پکڑ لیں۔

"چوہدری!" ـــــ خالق نے کہا ـــــ "میں نے تجھ کو بتا دیا تھا کہ تیری زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں..... نیچے آجا چوہدری!"

چوہدری اسحٰق نے اپنی عادت کے مطابق ان دونوں پر رُعب جھاڑا اور گھوڑی کو ایڑ لگائی لیکن گھوڑی مظفر کے قبضے میں تھی۔

"مظفر بیٹے!" ـــــ چوہدری کچھ نرم پڑ گیا اور بولا ـــــ "میں نے تجھ کو جیل سے بچایا تھا"

خالق نے بھی گھوڑی کے منہ کے قریب سے لگام کو پکڑا اور دونوں گھوڑی کو ساتھ والی اوٹ میں لے گئے۔ وہ ویران علاقہ تھا اور اوٹ بڑی اچھی تھی۔ مظفر نے چوہدری اسحٰق کا ایک بازو پکڑا اور زور سے نیچے کو کھینچا۔ دوسری طرف سے خالق نے اُس کا پاؤں رکاب سے نکال دیا اور اُس کی ٹانگ اوپر کو اُٹھائی۔ اس طرح دونوں نے مل کر اُس کو گھوڑی سے گرا دیا۔ خالق نے جیب میں موُدی کا تحفہ ریشمی رومال رکھا ہُوا تھا۔ اس کو اُس نے جلدی جلدی سے مروڑا اور چوہدری اسحٰق کی گردن میں ڈال کر پیچھے ایک گانٹھ دی اور رومال کے دونوں سروں کو پوری طاقت سے کھینچا جس طرح گانٹھ مضبوط کی جاتی ہے۔

اس دوران مظفر نے مقتول کا ایک پاؤں رکاب میں پھنسا دیا۔ مقتول کی پوزیشن یہ تھی کہ وہ تقریباً لیٹا ہُوا تھا۔

"تم نے رومال کھول کیوں نہیں لیا تھا؟" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "لاش کے ساتھ کیوں رہنے دیا؟"

"یہ مظفر کی غلطی تھی" ـــــ خالق نے جواب دیا ـــــ "اُس کے پاس چاقو تھا۔ اُس کے ذمے یہ کام تھے کہ مقتول کا پاؤں رکاب میں پھنسائے گا، زین کا تنگ چاقو سے آدھا کاٹے گا تاکہ زین ڈھیلی ہو کر ایک طرف ہو جائے اور لوگ سمجھیں کہ زین ڈھیلی ہو جانے سے سوار گرا تھا اور اُس نے تیسرا کام یہ کرنا تھا کہ گھوڑی کی پیٹھ پر دُم کے قریب چاقو کی نوک زور سے مارنی تھی تاکہ گھوڑی ڈر کر دوڑ پڑے..... مظفر نے یہ کام بہت جلدی کر دیئے گھوڑی

کو جا تو لگا ہی تھا کہ وہ دوڑ پڑی اور رومال کے سرے میرے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ مجھ کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ چوہدری مر گیا ہے۔"

گھوڑی تیز دوڑتی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ دونوں قاتل ذرا دیر انتظار کر کے دوسری طرف چلے گئے اور گھوم پھر کر واپس آ گئے۔

مجھ کو یاد ہے کہ میں جب لاش پوسٹ مارٹم کے واسطے بھیجنے لگا تھا تو مظفر نے مجھ کو کہا تھا کہ پوسٹ مارٹم کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو صاف پتہ لگتا ہے کہ چوہدری صاحب زین ڈھیلی ہو جانے کے باعث گر پڑے تھے اور پاؤں رکاب میں پھنسا رہ گیا۔ میں نے مظفر کو بتایا کہ پوسٹ مارٹم ضروری ہے تو اُس نے میرے ساتھ بحث شروع کر دی تھی اور میں نے اُس کو ڈانٹ کر چُپ کرایا تھا۔

خالق کے بعد میں نے مظفر کو اندر بُلایا۔ اُس کو جب پتہ لگا کہ خالق نے جرم کا اقبالی بیان دے دیا ہے تو اُس نے بھی اقبالی بیان دیدیا۔

"مجھ کو پھانسی چڑھنے کا کوئی افسوس نہیں ہو گا" ——— مظفر نے کہا۔ "زیور میں نے چوری کیا تھا اور سزا میری بہن کو ملی۔ میں بہن کو اس بوڑھے چوہدری سے آزاد کرانا چاہتا تھا۔ یہ کام کر دیا ہے۔ اب بہن مجھ سے ناراض نہیں ہو گی۔ میری دوسری خواہش پوری نہیں ہوئی۔ میں نے بہن کی شادی خالق کے ساتھ کرنی تھی۔"

خالق اگر رومال کی جگہ رسی کا ٹکڑا استعمال کرتا تو اِن دونوں کو پکڑنا بہت مشکل ہو جاتا۔ خالق جذبات میں آ گیا تھا۔ اُس نے مجھ کو بتایا تھا کہ وہ مُودی کی خاطر اُس کے خاوند کو قتل کر رہا تھا اس وجہ سے اُس نے مُودی کا ہی رومال استعمال کیا۔

خالد اور مُودی کا مقدمہ دو وکیلوں نے لڑا تھا لیکن میرا تیار کیا ہُوا مقدمہ اتنا مضبوط تھا کہ دونوں کو عمر قید دی گئی اور اپیل میں بھی سزا بحال رہی۔

رات کے رہزن

ایک ہی گاؤں میں پندرہ سولہ دن کے وقفے سے نقب زنی کی دو وارداتوں نے مجھ کو پریشان کر دیا۔ وہ علاقہ ڈکیتی کی وارداتوں کے لیے مشہور تھا لیکن نقب زنی بہت کم ہوتی تھی۔ نقب زنی کی بابت آپ جانتے ہوں گے کہ مکان کے پچھواڑے کی دیوار میں زمین کے ساتھ اتنا بڑا سوراخ کیا جاتا ہے جس میں سے ایک آدمی لیٹ کر گزر سکتا ہے اور اس میں سے بڑے سائز کا ٹرنک باہر نکالا جا سکتا ہے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ نقب زنی کی واردات گھر بھیدی کے بغیر نہیں کی جا سکتی۔ گھر بھیدی ڈاکوؤں کو بتاتا ہے کہ ٹرنک وغیرہ فلاں کمرے میں رکھے ہوئے ہیں۔ ڈاکو نقب لگا کر سیدھے اس کمرے میں پہنچتے ہیں اور ٹرنک اٹھا کر دیوار کے سوراخ میں سے باہر لے آتے ہیں۔

آج کل نقب زنی کا طریقہ واردات کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجرموں کو علاقے کی پولیس کی مدد حاصل ہوتی ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آج کل ریوالور سٹین گن وغیرہ جیسے ہتھیار عام ہو گئے ہیں۔ دن کے وقت بھی ڈاکو کسی گھر میں جا گھستے ہیں اور ریوالور سٹین گن یا کلاشنکوف کی نالی پر گھر والوں سے چابیاں اور راہنمائی حاصل کر لیتے ہیں۔ اتنی سہولتیں حاصل ہوں تو نقب لگانے کی تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ نقب زنی ماہروں کا کام تھا بعض تجربہ کار ڈاکو بھی نقب نہیں لگا سکتے تھے۔

نقب زنی کی ایک واردات میرے تھانے میں زیر تفتیش تھی۔ میرے پاس اس واردات کا صرف یہ سراغ تھا کہ ملزم اپنے کھرے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ پندرہ سولہ دنوں بعد اسی گاؤں میں نقب زنی کی ایک اور واردات کی رپورٹ آ گئی۔ میں جب موقعہ پر پہنچا تو کھوجی نے سب سے پہلے جو بات بتائی وہ یہ تھی کہ دو کھرے انہی ملزموں کے ہیں جنہوں نے پہلی واردات کی ہے۔

میں نے نقب لگی ہوئی دیکھی۔ دیہاتی علاقے میں اُس زمانے میں اکثر خوشحال لوگوں کے مکان بھی کچے ہوتے تھے۔ پکے مکان یعنی اینٹوں کے بنے ہوئے اُن زمینداروں کے ہوتے تھے جن کو آپ دولت مند زمیندار کہہ سکتے ہیں یا ہندو ساہوکاروں کے مکان پکے ہوتے تھے۔ یہ دونوں مکان جن میں نقب لگی تھی، اینٹوں کے بنے ہوئے تھے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ دونوں خاندان بہت امیر تھے۔

میں اب دوسرے مکان میں لگی ہوئی نقب بہت غور سے دیکھ رہا تھا اور اس کو پہلی یعنی دوسرے مکان والی نقب کے ساتھ ملا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ دونوں سوراخ یا اس کو شگاف کہہ لیں، ایک جیسے تھے۔ میں آپ کو تفصیلات نہیں سمجھا سکتا۔ یہ تجربہ کار نگاہوں کا کام ہے۔ عام لوگوں کی نگاہوں میں ہر نقب ایک جیسی ہوتی ہے۔ دوسری نقب کو مزید غور سے دیکھنے کی ضرورت تو نہیں تھی۔ یہ تو کھروں سے پتہ لگ گیا تھا کہ دونوں وارداتوں کے ملزم ایک ہیں۔

دونوں وارداتوں میں صرف ایک ایک ٹرنک گیا تھا۔ دونوں ٹرنکوں میں دونوں گھروں کی ایک ایک لڑکی کا زیور تھا۔ رقم بھی تھی اور ریشمی کپڑے تھے۔ دونوں لڑکیوں کی شادی ہونے والی تھی۔ یہ اُن کا زیور اور کپڑے تھے۔ دونوں وارداتوں میں ایسے ہی ہوا کہ ڈاکو نقب لگا کر اندر آئے اور ان ٹرنکوں کے اوپر رکھے ہوئے ٹرنک اور سوٹ کیس اتار کر نیچے رکھے اور مال والے ٹرنک اُٹھا کر لے گئے۔

نقب، ڈکیتی، سرقہ کی تفتیش اور سُراغ رسانی بہت ہی مشکل ہوتی ہے۔ یہ وارداتیں پیشہ ور کیا کرتے تھے، اس لیے پیشہ وروں کو ہی شامل تفتیش کیا جاتا ہے اور اُن سے پوچھ گچھ کا دوسرا بلکہ تیسرا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جس کو تھرڈ ڈگری کہتے ہیں یعنی ایذا رسانی۔ مخبروں سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ مدد صرف اُن مجرموں سے ملتی ہے جو خود جرائم پیشہ ہوتے ہیں مگر ان سے سُراغ لینا بھی مشکل ہوتا تھا۔ اس مشکل کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ ایک دوسرے کو دھوکہ نہیں دیتے تھے۔

جب سے پہلی واردات ہوئی تھی میرے تھانے میں ہر وقت رونق لگی

رہتی تھی۔ سارے علاقے کے مشتبہ لوگوں کو تھانے بلایا جاتا تھا۔ ان میں سے تین چار آدمی ہر وقت تھانے میں موجود رہتے اور ان سے پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ رات کو ان کی چیخ و پکار تھانے کے احاطے کے باہر تک سنائی دیتی تھی۔

میرے تھانے کے علاقے میں تین مشہور نقب زن تھے اور تینوں سزا یافتہ تھے۔ اُن کو میں نے دوسری واردات ہو جانے تک تھانے میں بٹھایا ہُوا تھا۔ دوسری واردات ہو گئی تو یہ تینوں بار بار مجھ کو کہنے لگے کہ ہم تھانے میں ہیں اور واردات ہو گئی ہے۔ اب بتائیں کہ یہ کس نے کی ہے میں خود پریشان ہو گیا کہ نقب زنی کے استاد تو میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان تینوں کو الگ الگ کر کے اس سوال پر چھینٹی لگانی شروع کر دی کہ مجھ کو یہ بتاؤ کہ تمہارے کون کون سے شاگرد ہیں جنہوں نے یہ کام جاری رکھا ہُوا ہے۔ وہ انکار کرتے رہے۔

قصہ مختصر یہ کہ پہلی واردات کا ذرا سا بھی کھُرا کھوج نہیں ملا تھا کہ دوسری واردات ہو گئی۔ ان سب پیشہ وروں میں سے کسی نے بھی اقبال نہ کیا تھا نہ ہی مدد کی تھی۔ دوسری واردات کی تفتیش بھی ایسی ہی ہوتی تھی لیکن میں ناکام ہو چکا تھا۔ ملزم نہ ملنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ نقب زن کسی دوسرے علاقے سے آئے تھے اور اُن کا گھر بھیدی پہلے سے یہاں موجود تھا، لیکن سوال یہ پیدا ہُوا ـــــ "کیا دونوں گھروں میں ایک ہی گھر بھیدی تھا یا وہ دو تھے؟"

میں نے دونوں گھروں کے نوکر اور ان کے گھروں میں تھوڑے تھوڑے وقت کے واسطے کام کرنے والوں کو بھی تھانے بٹھایا ہُوا تھا۔ اب مجھ کو بہت گہرا اُترنے کی ضرورت تھی۔ یہ بات بالکل صاف ہو چکی تھی کہ ڈاکوؤں کو گھر بھیدی کی رہنمائی حاصل تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ڈاکو صرف ایک ایک ٹرنک بمع تالے یعنی مقفل لے کر نہ جاتے۔ دونوں گھروں میں سے ایک سے زائد ٹرنک غائب ہوتے اور کہیں نہ کہیں راستے میں ایسے ٹرنک پڑے مل جاتے جو ان کے کام کے نہیں تھے۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ ٹرنکوں والے کمروں میں مرد نوکر نہیں جایا کرتے اور گھروں کی عورتیں کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا کرتیں کہ وہ زیور اور رقم کہاں رکھتے ہیں۔ نوکرانیاں ٹرنکوں والے کمروں تک جاتی ہیں۔ گھر کی عورتیں ان سے محتاط رہتی ہیں لیکن گھروں میں کام کرنے والی عورتیں اتنی چالاک اور ہوشیار ہوتی ہیں کہ وہ بڑے بڑے گھروں کی عورتوں کے ساتھ سہیلیوں جیسی بے تکلفی پیدا کر لیتی ہیں اور ان کی راز داں بھی بن جاتی ہیں۔ میں نے گاؤں کی ایسی تین عورتوں کو تھانے میں بٹھایا ہوا تھا لیکن وہ ہاتھ جوڑنے، منتیں کرنے اور رونے کے سوا کوئی جواب نہیں دیتی تھیں۔ ان میں سے ایک عورت پر مجھ کو شک تھا۔ میں نے عورتوں پر ابھی تشدد شروع نہیں کیا تھا۔

اب ایک کی بجائے ایک ہی جیسی دونوں وارداتوں کی تفتیش اکٹھی شروع ہو گئی۔ میں آپ کو ساری تفصیل اور باریکیاں نہیں سنا رہا۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ ان تمام مشتبہوں سے پندرہ بیس روز جھک جھک کر کے اور اپنا مغز کھپا کر میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ میرے ملزم ان میں نہیں تفتیش کی دوسری لائن یہ ہو سکتی تھی کہ میں دونوں گھروں کے افراد پر ہی شک کروں۔ پڑھنے والوں کو یہ بات عجیب لگے گی کہ گھر کے کسی فرد نے ہی اپنا مال و دولت لٹوا دیا ہوگا۔ جناب احمد یار خان اور میں نے ایسی کہانیاں سنائی ہیں جن میں نقب زنی اور ڈکیتی اپنے گھروں میں گھر کے افراد نے ہی کرائی تھی۔ ان افراد میں جوان لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ پولیس کی نگاہ میں ایسی وارداتیں عجوبہ نہیں سمجھی جاتیں۔

دونوں گھروں سے جو مال گیا وہ لڑکیوں کا جہیز تھا۔ ایسی وارداتیں میرے سامنے آ چکی تھیں کہ کسی گھر کی لڑکی کسی اور کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے لیکن کسی اور کے ساتھ زبردستی کی جا رہی ہے۔ اتفاق سے لڑکی غیر معمولی طور پر مضبوط دل گردے والی ہوئی اور گھر والوں نے اس پر تشدد بھی کیا تو اس نے انتقام اس طرح لیا کہ اپنے ہی گھر اپنی پسند کے آدمی کے ذریعے ڈکیتی کی واردات کرا دی۔

میرے ہاتھ میں ان گھروں کی تین نوکرانیاں تھیں۔ مجھ کو ان سے

دونوں گھروں کی لڑکیوں کی بابت جملہ معلومات مل سکتی تھیں۔

دو عورتوں نے کوئی خاص بات نہ بتائی۔ میں نے جب اُن پر تھانیداری کا دباؤ ڈالا تو وہ منتیں کرنے لگیں کہ انہوں نے کوئی ایسی ویسی بات کہہ دی تو اُن کے مالک اُن کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ دونوں خاندان روپے پیسے والے تھے۔ مجھ کو یہ بھی پتہ لگ گیا تھا کہ ان دونوں خاندانوں کی اخلاقی حالت ایسی نہیں تھی کہ ان کی تعریف کی جاتی، لیکن اُن کا اخلاق اتنا بُرا بھی نہیں تھا کہ میں ان کو بدنام لوگ کہتا۔ ان دو عورتوں نے میرے رُعب میں آکر دوسری واردات والے

گھر کی لڑکی کی بابت کچھ شک ظاہر کیا۔ وہ کہنے لگیں کہ اُس میں شرم اور حیا ہے ہی نہیں۔ میں نے اُن سے مزید تحقیقات کی تو وہ مجھ کو کوئی جواب نہ دے سکیں۔ دونوں نے یہ ضرور کہا کہ یہ لڑکی کسی نہ کسی کے ساتھ اچھے یا بُرے طریقے سے پھنسی ہوئی ہے۔

میں نے تیسری عورت کو بلایا۔ اس کی بابت میں نے آپ کو بتایا ہے کہ چالاک اور ہوشیار عورت تھی۔ اُس کے چہرے میں اور رنگ روغن میں اور جسم کی بناوٹ میں ایک خاص کشش تھی۔ اُس کی عمر تیس بتیس سال ہوگی۔ میں نے اُس کی آنکھوں سے، انداز سے اور بات کرنے کے طریقے سے سمجھ لیا کہ یہ عورت پولیس کی تفتیش میں بہت مدد کرنے والی ہے۔ جسم اور باتوں سے پھرتیلی لگتی تھی۔ اُس کا نام برکت تھا۔

"تھانیدار جی!" ـــــ اُس نے میرے پاس آتے ہی مجھ سے سوال کیا ـــــ "آپ نے مجھ کو اور ان دو غریب عورتوں کو اتنے دنوں سے کیوں بٹھایا ہوا ہے؟ کیا یہ سَن (نقب) میں نے لگائی ہے؟ کچھ خدا کا خوف کرو۔"

اُس کی اس بے تکلفی سے مجھ کو اطمینان ہوا کہ کوئی گڑبڑ والی بات ہوئی تو وہ مجھ کو ضرور بتا دے گی۔

"بک کتے!" ـــــ میں نے مسکرا کر کہا ـــــ "کیا تمہیں یہاں دونوں وقت روٹی نہیں ملتی؟"

"کیا کرنی ہے یہ روٹی جس کے ساتھ بے عزتی بھی ہو" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "اگر مجھ کو روٹی کھلانے کا شوق ہے تو تھانے میں یا اپنے گھر میں مجھ کو نوکرانی رکھ لے"۔

"تم روٹی کی بات کرتی ہو"! ـــــ میں نے کہا ـــــ "نقد انعام دلاؤں گا"۔

"کس کام کا؟"

"انعام اس بات کا کہ میں جو کچھ پوچھوں وہ بالکل صحیح بتانا" ـــــ میں نے کہا ـــــ "میں جانتا ہوں برکتے! تم کو سب معلوم ہے..... جن دو لڑکیوں کے زیور اور کپڑے چوری ہو گئے ہیں یہ لڑکیاں چال چلن کی کیسی ہیں؟ کیا یہ خوش ہیں کہ ان کی شادی ہو رہی ہے؟" ـــــ میں نے برکتے کو اچھی طرح سمجھایا کہ میں کیا معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی واردات والے گھر کی بابت برکتے نے صاف رپورٹ دی اور اُس نے یہ بھی بتایا کہ لڑکی کو یہی لڑکا اور یہی گھر پسند ہے جہاں اُس کی شادی ہو رہی ہے۔ دوسری لڑکی کی رپورٹ شک والی تھی۔ اس لڑکی کا نام فاطمہ تھا۔

"وہ ہنستی زیادہ ہے" ـــــ برکتے نے بتایا ـــــ "اور چھیڑ چھاڑ ہر کسی کے ساتھ کرتی ہے۔ مردوں سے ذرا سا بھی نہیں شرماتی"۔

"مجھ کو ایک بات بتاؤ برکتے!" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "کیا اس لڑکی کی کسی ایسے آدمی کے ساتھ دوستی ہے جس کے ساتھ وہ شادی کرنا چاہتی ہے؟"

"تھانیدار جی!" ـــــ برکتے نے کہا ـــــ "آپ کو میرے خلاف کوئی دشمنی ہے؟ آپ مجھ سے سچی باتیں سننا چاہتے ہیں لیکن آپ شاید نہیں جانتے کہ گاؤں کے چوہدریوں کے گھروں کی باتیں ظاہر کر دینے کی مجھ کو سزا کیا ملے گی"۔

میں نے اُس کو یقین دلایا کہ یہ کسی کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ اُس نے مجھ کو کچھ بتایا ہے۔ اُس نے یہ انکشاف کیا کہ فاطمہ کے تعلقات ایک

آدمی کے ساتھ ہیں جس کی عمر تیئس چوبیس سال تھی۔ اُس کا نام مشتاق یا اشتیاق تھا۔ میں اُس کو مشتاق لکھوں گا۔ اُس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ ان کے درمیان بر کتے رابطے کا کام کرتی تھی۔ فاطمہ نے بر کتے کو کئی بار بتایا تھا کہ وہ مشتاق کے سوا کسی اور کو قبول نہیں کرے گی۔ بر کتے کو معلوم نہیں تھا کہ ان دونوں کی محبت پاکیزہ تھی یا کیسی تھی۔ اُس نے مجھ کو بتایا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں پاگل ہو گئے ہیں۔

"لیکن فاطمہ کی تو شادی ہو رہی ہے" ۔۔۔ میں نے کہا۔

"ابھی دن مقرر نہیں ہوا" ۔۔۔ بر کتے نے جواب دیا ۔۔۔ "فاطمہ مان نہیں رہی۔"

دیہات میں اتنی آزادی تو لڑکیوں کو آج بھی حاصل نہیں کہ شادی کے معاملے میں ماں باپ کی پسند کو قبول نہ کریں۔ اُس زمانے میں تو کوشش یہ ہوتی تھی کہ لڑکی کو پتہ ہی نہ لگے کہ اُس کی شادی کس کے ساتھ کی جا رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ لڑکیوں کو پتہ لگ جاتا تھا۔ وہ اپنے منگیتر کی ماں یا باپ کا نام بھی اپنی زبان پر نہیں لاتی تھیں۔ محبت خواہ پاک ہو، اتنا بڑا جرم سمجھا جاتا تھا کہ اس کی سزا موت بھی ہو سکتی تھی۔

فاطمہ کے خاندان جیسے امیر زمیندار خاندانوں میں قابلِ اعتراض تعلقات بھی چلتے تھے لیکن لڑکیوں کو اپنی پسند کی پھر بھی اجازت نہیں تھی۔ فاطمہ کی بابت بر کتے نے بتایا کہ اُس کو باپ اور بڑے بھائی نے بہت مارا پیٹا تھا۔

"کیا فاطمہ نے ان کو بتایا تھا کہ وہ مشتاق کو چاہتی ہے؟"

"بتا چکی ہے" ۔۔۔ بر کتے نے جواب دیا ۔۔۔ "نہ بتاتی تو بھی سب کو پتہ تھا۔"

"مشتاق کو کسی نے کچھ نہیں کہا؟"

"کہا کیوں نہیں؟" ۔۔۔ بر کتے نے کہا ۔۔۔ "مشتاق ان کی برادری کا لڑکا ہے۔ اُس کو اُس کے ماں باپ نے گھر سے نکال دینے کی دھمکی دی تھی اور خون خرابہ ہوتے ہوتے رہا تھا۔"

"فاطمہ اپنی سہیلیوں کو یا اپنی کسی سب سے زیادہ عزیز سہیلی کو بتاتی ہو گی کہ اب وہ کیا کرے گی" ـــــ میں نے کہا۔

"سارے گاؤں کی لڑکیاں اُس کی سہیلیاں ہیں" ـــــ برکتے نے بتایا ـــــ "لیکن وہ دل کے راز کی باتیں صرف میرے ساتھ کیا کرتی ہے۔ وہ صاف کہتی ہے کہ میں مشتاق کے ساتھ گھر سے بھاگ جاؤں گی"۔

"تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ مشتاق کیا کہتا ہے؟" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "کیا وہ اتنا دلیر ہے کہ فاطمہ کو گھر سے بھگا کر کہیں لے جائے؟"

"تھانیدار جی!" ـــــ برکتے نے کہا ـــــ "آپ دلیری کی بات کرتے ہیں۔ وہ تو جیسے اپنے باپ کا ہے ہی نہیں۔ سخت لڑاکا اور دلیر جوان ہے۔ اُس کے جسم میں گھوڑے جیسی طاقت ہے، وہ تو فاطمہ کو اُٹھا کر لے جائے"۔

یہ دلکش عورت جس کا نام برکت تھا اور پیشہ اُونچے گھرانوں میں نوکری چاکری اور خدمت گزاری تھا، مجھ کو ملزموں کے قریب لے گئی تھی۔ میں نے اُس سے اور بھی کئی باتیں پوچھیں لیکن جو میں معلوم کرنا چاہتا تھا وہ بات اُس کے منہ سے نہ نکلی۔ وہ بہت نیچی سطح کی عورت تھی۔ میں اُس سے یہ راز نہیں لینا چاہتا تھا کہ مشتاق نے فاطمہ کی رضامندی سے اُس کے گھر میں نقب زنی کی واردات کی ہے یا کروائی ہے۔ یہ پتہ لگانے کے واسطے میرے پاس دوسرے ذریعے موجود تھے۔ میں نے فاطمہ کو سختی سے کہا کہ میرے ساتھ اُس کی جو باتیں ہوئی ہیں، ان کا وہ کسی کے ساتھ ذکر نہ کرے۔

مجھ کو یہ اطمینان ہو رہا تھا کہ میں نے دوسری واردات کا سُراغ لگا لیا تو پہلی واردات کے ملزم بھی پکڑے جائیں گے۔ اس واسطے کہ دونوں وارداتوں کے موقعوں پر کھرے ایک ہی جیسے تھے۔ دیہات میں تو نوّے فی صد کھرے ایک ہی جیسے ہوتے تھے۔ سب ایک ہی قسم کی دیسی جوتی پہنتے تھے، پھر بھی کھوجی ان میں فرق معلوم کر لیتے تھے لیکن وارداتوں والے کھروں میں ایک کھرا بالکل الگ تھلگ تھا۔ یہ دیسی جُوتی کا نہیں تھا۔ یہ شُوز کا

تھا یا گُرگابی کا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ مُلزم شوقین مزاج ہے۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا تھا کہ یہ بڑے پیمانے کی وارداتیں کرنے والا آدمی ہے۔ دیہات میں گُرگابی خوشحالی کی علامت تھی۔

میں نے پہلی واردات کی تفتیش میں نمبردار، ذیلدار وغیرہ کی مدد لی تھی لیکن اُس وقت میرے سامنے کوئی واضح لائن نہیں تھی۔ اب برکت نے ایک بڑی صاف لائن دے دی تھی۔ ایک مُشکل یہ تھی کہ نمبردار بھی اسی برادری کا تھا اور ذیلدار بھی۔ دو سفید پوش تھے۔ اُن کا تعلق بھی اسی برادری کے ساتھ تھا۔ مَیں نے نمبردار کو اپنے پاس بٹھایا۔

"فاطمہ کے گھر کے ساتھ تمہارا کوئی خون کا رشتہ ہے؟" ——— مَیں نے اُس سے پوچھا۔

"جی ہاں" ——— اُس نے جواب دیا ——— "رشتہ خون کا ہے لیکن ذرا دُور کا ہے.... آپ نے فاطمہ کا نام کیوں لیا ہے؟"

"دیکھو چوہدری!" ——— مَیں نے کہا ——— "تمہارا رشتہ ہے یا نہیں، اس وقت تم اس خاندان کے نہیں بلکہ سرکار کے آدمی ہو۔ مَیں جو پوچھوں وہ بالکل ٹھیک بتانا۔ تم جانتے ہو کہ تفتیش کس طرح ہوتی ہے۔ مَیں نے گاؤں کے بہت سے لوگوں سے بہت سی باتیں معلوم کر لی ہیں۔ اگر مجھ کو پتہ چل گیا کہ تم نے کوئی بات چھپائی ہے تو اپنی سزا سوچ لو۔ مَیں تمہاری نمبرداری نہیں رہنے دوں گا۔"

"دہم نہ کریں سرکار!" ——— اُس نے خوشامدی لہجے میں کہا ——— "آپ پوچھیں تو سہی۔"

"فاطمہ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

"مَیں اُس کو پاگل تو نہیں کہتا سرکار!" ——— نمبردار نے جواب دیا ——— "اُس کا دماغ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس لڑکی میں شرم و حیا ہے ہی نہیں۔ اصلی بات یہ ہے سرکار کہ وہ جانتی ہی نہیں کہ شرم اور حیا کِسے کہتے ہیں۔"

مَیں آپ کو لمبی چوڑی تفصیل نہیں سُنا رہا۔ نمبردار نے جب فاطمہ کی

عادتیں اور حرکتیں بیان کیں تو میری رائے بھی یہی ہو گئی کہ لڑکی کا یا تو دماغ صحیح نہیں یا مشتاق کی محبت اور ماں باپ کی مار پٹائی نے اس کا دماغ صحیح نہیں رہنے دیا، لیکن نمبردار کہتا تھا کہ لڑکپن میں بھی فاطمہ کی ذہنی حالت ایسی ہی تھی۔ میں نے نمبردار سے فاطمہ اور مشتاق کے تعلقات یا محبت کی بابت پوچھا۔

"یہ لڑکا ٹھیک ٹھاک ہے سرکار!"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "لیکن ہٹ کا اتنا پکا اور ڈھیٹ ہے کہ جہاں اس کا دماغ اٹک گیا وہاں سارے گاؤں کا مقابلہ کرے گا اور ہٹے گا نہیں۔ فاطمہ کے ساتھ اُس کا تعلق بڑا گہرا ہے اور اس تعلق نے اُس کو اور زیادہ ڈھیٹ اور بیوقوف بنایا ہوا ہے۔"

"چوہدری مہردین!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "تم عمر رسیدہ اور سیانے آدمی ہو..... فاطمہ اور مشتاق نادان عمر میں ہیں۔ تم کہتے ہو کہ فاطمہ کا دماغ صحیح نہیں اور مشتاق کا دماغ اُس کی محبت میں صحیح نہیں رہا۔ اگر میں یہ کہوں کہ فاطمہ اور مشتاق گاؤں سے بھاگ جانا چاہتے ہیں اور یہ اُن کا پکا ارادہ ہے اور دونوں نے مل کر فاطمہ کی شادی کا بنا ہوا زیور اور اُس کے کپڑے چوری کیے ہیں تو تم کیا کہو گے؟"

"سچ پوچھیں سرکار!"۔۔۔ نمبردار نے کہا۔۔۔ "تو میں کہوں گا کہ مشتاق اس سے زیادہ خطرناک کام کر سکتا ہے لیکن بغیر ثبوت کے میں کیا کہہ سکتا ہوں.... لیکن سرکار! ذرا اس پر غور کریں کہ فاطمہ اپنا زیور اور اپنے کپڑے غائب کرانا چاہتی تو وہ آسانی سے زیور، رقم اور دو تین جوڑے کپڑے چھوٹی سی گٹھڑی میں باندھ کر غائب کر سکتی تھی۔ نقب لگانے کی مصیبت سر لینے کی کیا ضرورت تھی؟"

"نقب یہ شک ڈالنے کے لیے لگوائی گئی ہے کہ ملزم باہر کے آدمی ہیں"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "مشتاق کی یاری کسی چور یا ڈاکو کے ساتھ ہو گی۔"

"وہ تو ہے"۔۔۔ نمبردار نے کہا۔۔۔ "اُس کی یاری کسی شریف آدمی کے ساتھ ہے ہی نہیں۔ اُس کے سب یار بدمعاش ہیں جن میں دو دس نمبریے ہیں۔"

"اُن کے نام لو"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "اور یہ بتاؤ کہ اُن میں کوئی ایسا

بھی ہے جو چوری ڈکیتی کی وارداتیں کرتا ہو؟"

اُس نے دو نام بتائے۔ مَیں نے اُن کی بابت تفصیل پوچھی تو پتہ چلا کہ انہوں نے نقب زنی جیسا بڑا جُرم کبھی نہیں کیا اور شاید اُن میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی۔ پھر بھی مَیں نے اُن کے نام لکھ لیے۔ نمبردار کو مَیں نے کہا کہ مشتاق کو اور دونوں آدمیوں کو تفتیش کے واسطے حاضر کرے۔ مَیں نے اُس کو بڑی سختی سے کہا کہ وہ کسی کو نہ بتائے کہ میری اُس کے ساتھ کیا باتیں ہوئی ہیں۔

نمبردار کے جانے کے بعد میں نے ذیلدار کو بُلایا۔ یہ شخص نمبردار کی نسبت کچھ زیادہ عقل والا تھا اور ویسے بھی معزز آدمی تھا۔ اس کے ساتھ بھی میری وہی باتیں ہوئیں جو نمبردار کے ساتھ ہوئی تھیں۔ اُس نے فاطمہ اور مشتاق کے چال چلن، عادتوں اور اُن کے آپس کے تعلقات کی بابت وہی باتیں کیں جو نمبردار کر چکا تھا۔ یہ ذیلدار اسی برادری کا فرد تھا، لیکن سرکار کے ساتھ اس کی وفاداری زیادہ تھی۔ باتوں باتوں میں اُس نے ایک دو باتیں فالتو بتا دیں۔

"مشتاق اور فاطمہ کی شادی ہو سکتی تھی" ــــ ذیلدار نے کہا ــــ "لیکن مشتاق کے والدین نے فاطمہ کا رشتہ مانگا ہی نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ فاطمہ دیکھنے میں بہت خوبصورت ہے لیکن بچپن سے ہی اُس کو کوئی ذہنی عارضہ ہے۔ کسی گھر میں ماتم ہو تو فاطمہ کے والدین اُس کو ماتم والے گھر نہیں جانے دیتے۔ یہ لڑکی میت کے پاس کھڑے ہو کر بھی ہنس پڑتی ہے۔ مشتاق کے والدین اس قسم کی لڑکی کو بہو بنا کر اپنے گھر میں نہیں لا سکتے تھے۔"

"اب بھی تو اُس کی شادی کسی کے ساتھ ہو رہی ہے" ــــ مَیں نے کہا ــــ "کیا لڑکے والے اُس کو نہیں جانتے؟"

"جانتے ہیں جی!" ــــ ذیلدار نے جواب دیا ــــ "یہ ساتھ والے گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ ہماری برادری کا گھرانہ ہے، لیکن ذرا کمزور لوگ ہیں اور لڑکا بھی جسمانی طور پہ ذرا نقص دار ہے۔ ایک ٹانگ کھینچ کر چلتا ہے اور چہرے مُہرے سے بھی کوئی خاص نہیں۔ برادری سے اُس کو یہی رشتہ مل سکتا تھا۔"

میں نے اُس سے بھی رائے پوچھی کہ یہ کہاں تک ممکن ہے کہ مشتاق اور فاطمہ نے یہ واردات خود ہی کرائی ہے۔ اُس نے بھی نمبردار جیسا جواب دیا۔

"فاطمہ چال چلن کی کیسی ہے؟"

"کچھ نہ پوچھو جناب!" ___ ذیلدار نے بُرا سا منہ بنا کر جواب دیا ___ "جو لڑکی اپنے نوکر کے ساتھ لگی رہی ہے اُس کا چال چلن کیا پوچھتے ہو"۔

"آپ لوگوں نے روکا نہیں؟"

"صرف روکا ہی نہیں" ___ اُس نے جواب دیا ___ "اُس کی ہڈیاں توڑ کر گاؤں سے نکالا تھا۔ وہ تھا تو نوکر چاکر لیکن مشتاق جیسا خوبصورت جوان تھا اور وہ اپنے آپ کو نوکر سمجھتا ہی نہیں تھا۔ چھوٹی ذات کا آدمی بڑی ذاتوں کے کان کترتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ فاطمہ کے باپ کا خاص آدمی تھا"۔

ذیلدار نے جب اس نوکر کی بابت چھوٹی چھوٹی اور بڑی بڑی باتیں بتانی شروع کیں تو مجھ کو خیال آیا کہ یہ نوکر بھی میرا اتنا ہی مشتبہ ہے جتنا مشتاق ہے۔ مجھ کو بتایا گیا کہ اس کا یارانہ مشکوک اور نامی گرامی بدمعاشوں اور ڈکیتوں کے ساتھ بھی تھا۔ اس طرح اور بھی بہت سی باتیں بتائی گئیں تو میں نے ذیلدار سے پوچھا کہ وہ اب کہاں ہے اور اُس کو یہاں سے نکلے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔

"اُس کو یہاں سے نکلے ہوئے دو اڑھائی مہینے ہوتے ہیں" ___ ذیلدار نے جواب دیا اور ایک گاؤں کا نام لے کر اُس نے کہا ___ "وہ وہاں رہتا ہے.... اور جناب پہنے کی بات ہے کہ اُس کو کسی خانقاہ یا میلے پر فاطمہ کے ساتھ دیکھا گیا تھا"۔

"کیا مشتاق کو معلوم نہیں؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا جناب!" ___ ذیلدار نے کہا ___ "یہ بھی تو بیوقوف آدمی ہے۔ شاید اسی پر خوش ہو گا کہ لڑکی اُس کو مل گئی ہے"۔

میں نے اس نوکر کو بلانے کا انتظام کر دیا۔ اُس کے خلاف شک کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُس کو بہت بُری طرح مار پیٹ کر گھر سے ہی نہیں

گاؤں سے بھی نکال دیا گیا تھا۔

دونوں سفید پوشوں نے بھی یہی باتیں بتائیں جو نمبردار اور ذیلدار بتا چکے تھے۔ مجھ کو شامل تفتیش کرنے کے واسطے جن لوگوں کی ضرورت تھی اُن سب کو تھانے چلنے کو کہا۔ ان میں مشتاق بھی تھا جس نے آتے ہی مجھ سے پوچھا کہ میں نے اُس کو کیوں بلایا ہے۔

"مجھ کو تمہاری مدد کی بہت ضرورت ہے مشتاق!" ـــــ میں نے ایسے لہجے میں کہا جیسے میں اُس کی مدد کے بغیر تفتیش میں ایک قدم نہیں چل سکوں گا۔

وہ اتنا کھوکھلا آدمی تھا کہ خوش ہو گیا اور اس نے سر ذرا اور اونچا کر لیا۔

میں تھانے میں آ گیا۔ مجھ کو یہ خیال بھی آتا تھا کہ میں غلط راستے پر جا رہا ہوں۔ اگر دوسری یعنی فاطمہ کے گھر والی نقب زنی فاطمہ اور مشتاق نے کرائی ہے تو پہلی واردات کس کی ہے؟ میں اپنے آپ کو اس خیال سے تسلّی دیتا تھا کہ پہلی واردات پیشہ ور نقب زنوں نے کی ہے اور دوسری واردات انہی سے کرائی گئی ہے اور مشتاق کی ان کے ساتھ دوستی ہو گی۔

میں نے ابھی ایک اور مشتبہ کو نہیں بلایا تھا ـــ یہ تھی فاطمہ ـــ میں جب تھانے پہنچا اُس وقت سورج غروب ہو چکا تھا۔ میں فاطمہ کو رات کے وقت بُلانا اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ میں اپنے گھر چلا گیا۔ مشتبہوں کو تھانے میں بٹھلائے رکھا۔ میں کھانا کھا کر سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو گھڑی دیکھی۔ رات کے اڑھائی بج رہے تھے۔ میں تھانے میں آیا۔ فاطمہ کے گھر کا نوکر بھی آ گیا تھا۔ اس کو دیکھ کر مجھ کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ کسی گھر کا نوکر ہے۔ میں نے اُس کو اپنے دفتر میں بُلا کر بٹھا لیا۔ اُس کا نام غالباً الف دین تھا اور الف کے نام سے مشہور تھا۔ اس کو تھانے میں بُلایا گیا تھا، اس وجہ سے وہ بہترین کپڑے پہن کر آیا تھا۔ وہ میرے دفتر میں داخل ہوا تھا تو میں نے سب سے پہلے اُس کے پاؤں کی طرف دیکھا تھا۔ اُس کے پاؤں میں گرگابی تھی۔

میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ وہ فاطمہ کے گھر جیسے ایک بڑے

زمیندار کے گھر میں ملازم ہے۔

"میری بات غور سے سُن اسلفے!" ___ مَیں نے دوستی کے لہجے میں کہا ___ "مَیں نے تجھے شک میں نہیں بُلایا۔ تیرے خلاف شہادت ملی ہے۔ اگر تُو صبح تک مال برآمد کرا دے تو مَیں تیری بچت کی صورت پیدا کر سکتا ہوں۔"

"کون سا مال؟" ___ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"فاطمہ کے گھر کا مال!" ___ مَیں نے کہا ___ "نقب تُو نے لگائی ہے۔"

وہ بے چین ہو گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کچھ کہنے لگتا تو زبان ساتھ نہ دیتی۔

"سرکار!" ___ اُس نے آخر کہا ___ "آپ کے سپاہی نے جو مجھ کو بُلانے گیا تھا، بتایا ہے کہ اس گاؤں میں ایک اور نقب لگی ہے۔ آپ میرے مالکوں سے پوچھیں کہ کل رات میں کہاں تھا" ___ اُس نے اپنے مالک کا نام لے کر کہا ___ "میں نے ساری رات اُن کے کمرے میں گزاری ہے۔ اُن کو تکلیف تھی آدھی رات تک تو مَیں اُن کا سَر اور ٹانگیں دباتا رہا پھر اُن کے کہنے پر وہیں فرش پر بستر بچھا کر سو گیا۔ صبح تک دو بار انہوں نے جگایا۔"

"چلو مان لیا" ___ مَیں نے کہا ___ "اپنے اُس دوست کی نشاندہی کر دو جس سے تم نے یہ واردات کرائی ہے۔"

اُس نے صاف انکار کیا۔ کہتا تھا کہ نقب لگانے والا اُس کا کوئی دوست نہیں۔ مَیں نے اُس پر سوالوں کے تیر برسانے شروع کر دیے۔ اُس کو ڈرایا دھمکایا اور لالچ بھی دیے لیکن وہ مسلسل انکار کرتا رہا۔ مَیں نے فاطمہ کے ساتھ اُس کے تعلق کی بابت بہت سے سوال کیے تھے۔ اُس نے اس تعلق سے انکار نہیں کیا۔

"اگر آپ کو یہ شک ہے کہ فاطمہ کے باپ اور بڑے بھائی نے میری جو پٹائی کی تھی مَیں نے اُس کا انتقام لیا ہے تو یہ غلط ہے" ___ اُس نے کہا ___ "انہوں نے مجھ کو بے گناہ تو نہیں مارا تھا۔ میں قصوروار تھا.... اور آپ نے یہ شک بھی کیا ہے کہ فاطمہ میرے ساتھ گھر سے بھاگنے کے لیے تیار تھی اور وہ اپنا زیور اور رقم بھی ساتھ لانا چاہتی تھی اور میں نے زیور اور رقم نکلنے

کے واسطے نقب لگائی ہے۔ سرکار! پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ میرے ساتھ شادی تو نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اُس کو میری جتنی ضرورت تھی، بس اُس نے میرے ساتھ اتنا ہی تعلق رکھا۔ اگر میں نے انتقام لینا ہوتا تو فوراً لے لیتا اور یہ نقب زنی کی یا ڈکیتی کی واردات نہ ہوتی، یہ قتل کی واردات ہوتی۔"

صبح ہو گئی لیکن اس شخص نے جرم کا اقبال نہ کیا۔ اُس نے میرے بہت سارے شک رفع کر دیے تھے لیکن میں نے اُس کے بعض جوابوں کی تصدیق کرانی تھی۔ صبح کھوجی نے اُس کا کھرا دیکھ کر مجھ کو مایوس کر دیا۔ یہ موقعہ واردات والے کھرے سے ذرا مختلف تھا۔ اس کے باوجود اُس کو میں چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ میں نے یہ معلوم کرانا تھا کہ جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ اُس کے تعلقات ہیں کہ نہیں اور ایسی ہی چند اور باتیں تھیں۔ میں نے اُس کو تھانے میں پابند رکھا اور مشتاق کو بلایا۔ وہ واقعی بیوقوف آدمی تھا۔

"کچھ پتہ نہیں چلا؟" ـــ اُس نے مجھ سے پوچھا اور کہنے لگا ـــ "ملزم پکڑا جائے تو اُس کو میرے حوالے کر دینا۔ اُس کو گرفتار نہ کرنا۔ میں اُس کو قتل نہیں کروں گا۔ اُس کی ٹانگیں توڑ کر اُس کو اپاہج بنا دوں گا۔ وہ میری فاطمہ کا زیور اور کپڑے ہضم نہیں کر سکے گا۔"

"تم نے اُس کا رشتہ ہاتھ سے جانے کیوں دیا تھا؟" ـــ میں نے پوچھا ـــ "رشتہ کسی اور کو کیوں دے دیا گیا ہے؟"

"رشتہ دیا گیا ہے جناب!" ـــ اُس نے کہا ـــ "لڑکی تو نہیں دے دی۔ اُس نے اپنی زبان سے کہہ دیا ہے کہ میرے سوا کسی اور کو قبول نہیں کرے گی۔"

"مجھ کو معلوم ہے" ـــ میں نے کہا ـــ "وہ تمہارے ساتھ گھر سے بھاگنے کو تیار ہے اور تمہارا یہی ارادہ ہے۔ تم شیر ہو مشتاق خان! مرد محبت پر قربان ہو جایا کرتے ہیں.... لیکن اُس کو لے جاؤ گے کہاں؟"

"کہیں چلے جائیں گے" ـــ اُس نے کہا ـــ "خدا کی زمین تنگ نہیں۔ بہت دُور چلے جائیں گے۔"

"روپے پیسے کی ضرورت ہو گی" ـــ میں نے کہا ـــ "اگر فاطمہ کا زیور چوری نہ ہوتا تو ساتھ لے آتی۔"

"لعنت ہے ایسے مرد پر جو عورت کو کہے کہ گھر سے زیور چوری کر لانا"
——اُس نے کہا اور میری طرف جُھک کر بولا——"ہم اُن عاشقوں میں سے نہیں ہیں جناب عالی! میں اُس کو جہاں کہیں بھی لے جاؤں گا وہاں میں خود محنت مزدوری کر دوں گا۔"

وہ ایسی ہی باتیں کرتا رہا۔ وہ مجھ پر رُعب گانٹھ رہا تھا۔ میں سوالوں اور جرح کے ذریعے اُس کو اپنی لائن پر لانے کی کوشش کرتا تھا اور وہ اپنی لائن کو نہیں چھوڑتا تھا۔ میں نے اُس کو گرمانے کا پروگرام بنایا۔

"مشتاق!"——میں نے کہا——"فاطمہ کے گھر ایک نوکر ہُوا کرتا تھا .... اَلفا.... دو اڑھائی مہینے ہُوئے اُس کو اِن لوگوں نے گھر سے نکال دیا ہے۔ اُس کو کیوں نکالا ہے؟"

"وہ ٹھیک آدمی نہیں تھا"——اُس نے کہا——"بہت سر چڑھ گیا تھا۔ کمین ذات کا آدمی تھا، گلے پر پگڑی باندھتا اور گھر والوں کی برابری میں رہنے کی کوشش کرتا تھا۔"

"وہ تمہاری برابری بھی کرتا ہے"——میں نے اُس پر ایک اور پہلو سے حملہ کرتے ہوئے کہا——"تم فاطمہ پر پاگل ہُوئے جا رہے ہو اور فاطمہ الفے پر پاگل ہوتی رہی ہے۔ وہ چوبارے کے ایک کمرے میں اکٹھے پکڑے گئے تھے۔ دونوں کی جو پٹائی ہوئی تھی وہ معلوم نہیں ان دونوں نے کس طرح برداشت کر لی تھی۔"

مشتاق کی آنکھیں ٹھہر گئیں پھر اور زیادہ کھل گئیں پھر اُس کا مُنہ بھی تھوڑا سا کھل گیا۔

"میں نہیں مانتا"——اُس کے مُنہ سے سرگوشی نکلی——"اگر یہ صحیح ہے تو میں اُس کمینے الفے کو قتل کر دوں گا۔"

"میں تمہارے ان لفظوں پر ہی تم کو حوالات میں بند کر دوں گا"——میں نے کہا——"گاؤں کے کئی لوگ فاطمہ اور الفے کے تعلقات کے گواہ ہیں۔ کیا تم نے الفے کو تھانے میں نہیں دیکھا؟ تمہارے باپ نے تمہارے

واسطے فاطمہ کا رشتہ اسی وجہ سے نہیں لیا تھا کہ وہ اچھے چال چلن کی لڑکی نہیں۔ ایک طرف وہ تمہارے ساتھ محبت کا کھیل کھیلتی رہی اور دوسری طرف اُس نے لیفے کے ساتھ یارانہ لگایا ہُوا تھا..... یہ بھی پتہ نہیں کہ اس نے کس کس کے ساتھ دوستی لگائی ہوئی تھی"۔

مشتاق نے فاطمہ کی محبت کی باتیں شروع کر دیں۔ وہ شاید بھُول گیا تھا کہ وہ تھانے میں ایک تھانیدار کے سامنے بیٹھا ہے۔ وہ مجھ پر رُعب جھاڑ رہا تھا کہ فاطمہ جیسی خوبصورت لڑکی اُس پر مرتی ہے اور اس لڑکی کو حاسد لوگ بدنام کر رہے ہیں۔ وہ جذباتی بھی ہو گیا تھا لیکن میں اس کو گرمانا اور بھڑکانا چاہتا تھا۔ اس سے مجھ کو اُمید تھی کہ اُس کے دل سے راز باہر آجائے گا۔

"او بیوقوف!"۔۔۔ میں نے اُس کو کہا۔۔۔ "تم یہ بھی نہیں سمجھے کہ فاطمہ نے تمہارے ہاتھوں اپنا کام کرا لیا ہے۔ وہ الفے کے ساتھ گھر سے بھاگنے کے واسطے زیور، نقدی اور ریشمی کپڑے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ اُس نے یہ مال تم سے نکلوایا۔ تم اُس کے ہاتھوں میں کھیلتے رہے اور نقب لگا کر مال نکلوایا۔ اب پکڑے تم جاؤ گے"۔

اُس کو میں نے پہلے ہی ایک صدمہ پہنچایا تھا، اب دوسری چوٹ ماری تو وہ تڑپنے لگا۔ وہ جُرم قبول کرنے سے انکار کر رہا تھا۔

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو مشتاق!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "تم بڑے خطرناک چکر میں آگئے ہو۔ خاندانی آدمی ہو۔ میں تم کو اس چکر سے نکالنا چاہتا ہوں۔ سارا معاملہ میرے ہاتھ میں ہے۔ تم مُنہ سے کہو اور مال دے دو۔ میں کسی کو پتہ نہیں چلنے دوں گا کہ مال تم نے برآمد کرایا ہے"۔

"مجھ پر قتل کا الزام لگاؤ"۔۔۔ وہ غصے میں اُٹھ کھڑا ہوا اور سخت بے چینی اور غصے میں کہنے لگا۔۔۔ "تم لوگوں میں خدا کا بھی خوف نہیں ہے۔ دوسروں کی عزت کا بھی تم کو خیال نہیں۔ تھانیدار بن کر اپنے آپ کو خدا سمجھ لیتے ہو۔ میں دولت لگانے والا آدمی ہوں اور تم مجھ پر ڈکیتی کا الزام

لگا ہے، ہو۔ میں فاطمہ کو روپیوں میں تول کر لا سکتا ہوں۔"

وہ بولتا رہا اور اُس کا غصہ زیادہ ہوتا گیا۔ میں خاموشی سے سُنتا رہا۔

"اُٹھو اور مجھ کو حوالات میں بند کر دو" ــــ اُس نے کہا ــــ "تفتیش کرتے رہو۔ جرم میرے خلاف ثابت ہو جائے تو پھانسی کی سزا دینا اور اگر جرم الفے پر ثابت ہوتا ہے تو اُس کو میرے حوالے کر دینا۔"

میں نے اُس کو ٹھنڈا کر لیا اور پھر اُس کو فاطمہ اور الفے پر لے آیا۔

"خدا کے واسطے آپ یہ مان جائیں کہ یہ واردات میں نے نہیں کی اور نہ کرائی ہے" ــــ اُس نے کہا ــــ "مجھ کو اب ایک بات سمجھ آتی ہے.... خدا کو گواہ رکھ کر کہتا ہوں کہ فاطمہ کے ساتھ میرا تعلق بالکل پاک تھا۔ وہ کہتی تھی کہ میں نے تم کو اپنا خاوند قبول کر لیا ہے۔ میں نہیں مانتا تھا کبھی کبھی وہ ناراض ہو جاتی تھی۔ مجھ کو اب سمجھ آ گئی ہے۔ الفے کے ساتھ اُس کی شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ کمین ذات کو اتنی اونچی ذات کے امیر کبیر خاندان کی لڑکی نہیں مل سکتی تھی۔ فاطمہ نے شاید یہ سوچا تھا کہ وہ مجھ کو اپنا خاوند بنائے گی اور تعلق الفے کے ساتھ قائم رکھے گی۔ میں دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اُس کے ساتھ بہت باتیں ہوئیں۔ میں اُس کی ذہنی حالت دیکھ رہا تھا۔ مجھ کو صاف نظر آ رہا تھا کہ یہ ان دونوں کو قتل کر دے گا۔ یہ تو بعد کی بات تھی۔ میرا مسئلہ کچھ اور تھا۔ میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اس واردات کے ساتھ مشتاق کا کوئی تعلق نہیں۔ کسی جرم کے اصل مجرم بھی انکار ہی کیا کرتے ہیں اور بعض مجرم مار کھا کھا کر بے ہوش ہو جاتے ہیں لیکن ہوش میں آ کر انکار پر قائم رہتے ہیں پھر بھی پتہ لگ جاتا ہے کہ یہ شخص مجرم ہے۔ مشتاق کی جو حالت ہو گئی تھی اس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ واردات اُس نے نہیں کرائی پھر بھی میں نے اس کو شاملِ تفتیش رکھا۔

فاطمہ کا باپ اور بھائی اور اُس کے دو تین رشتہ دار تھانے میں آئے ہوئے تھے۔ میں نے فاطمہ کے باپ کو اندر بُلایا اور اُس کو کہا کہ وہ اپنی بیٹی کو جس کا نام فاطمہ ہے، تھانے لے آئے۔ اس شخص نے مجھ کو حیران ہو کر

دیکھا جیسے مَیں نے اُس کو گالی دے دی ہو۔ اُس نے مجھ سے وجہ پوچھی کہ اُس کی بیٹی کو کیوں بلایا جا رہا ہے۔

"تفتیش کے واسطے جناب!" ــــ مَیں نے کہا ــــ "آپ جا کر اپنی بیٹی کو لے آئیں۔"

"انسپکٹر صاحب!" ــــ اُس نے کہا ــــ "یہ تو بڑی بے عزتی کی بات ہے۔"

"مَیں تفتیش روک کر اپنی بے عزتی نہیں کرانا چاہتا" ــــ مَیں نے کہا ــــ "چوہدری جی! کیا آپ اپنی بیٹی کو نہیں جانتے؟"

"لیکن اُس کا اس واردات کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے؟" ــــ اُس نے پوچھا۔

"وہی تعلق ہو سکتا ہے جو اُس کا لطفے اور مشتاق کے ساتھ ہے" ــــ مَیں نے کہا ــــ "اور چوہدری صاحب! میرا دماغ اور زیادہ خراب نہ کریں۔ مَیں جو کہتا ہوں وہ کریں۔ فوراً یہاں سے چلے جائیں۔"

وہ سر جھکائے ہوئے باہر نکل گیا اور پانچ سات منٹ بعد چار پانچ آدمیوں کو ساتھ لے کر پھر میرے کمرے میں آ گیا۔ مَیں نے اُن کو بات کرنے کا موقع نہ دیا اور ڈانٹ کر باہر نکال دیا۔ وہ میری حکم عدولی نہیں کر سکتے تھے۔ فاطمہ کے آنے تک میں دو تین مخبروں سے مختلف اشخاص کی رپورٹیں لیتا رہا۔

ڈیڑھ دو گھنٹے بعد فاطمہ اپنے باپ کے ساتھ میرے دفتر میں داخل ہوئی۔ بڑے اچھے قد اور دلکش چہرے والی لڑکی تھی۔ مَیں نے اُس کے باپ کو کہا کہ وہ اس کو میرے پاس چھوڑ کر چلا جائے اور کوئی فکر نہ کرے۔ وہ اس طرح باہر نکلا جیسے اُس کے سر پر وزن رکھا ہوا ہو۔ مَیں اُس کی جذباتی حالت بہت اچھی طرح سمجھتا تھا حالانکہ میری عمر اتنی نہیں تھی۔ مَیں جوانی کی عمر میں تھا۔

"فاطمہ!" ــــ مَیں نے اُس سے پوچھا ــــ "تمہارے گھر میں چوری کس نے کی ہے؟"

وہ ہنس پڑی اور اُس نے گردن کو ذرا سا خم دے کر سر اس طرح ہلایا جس کا مطلب یہ تھا کہ اُس کو معلوم نہیں۔

"اگر تم کو معلوم ہے تو پردے پردے میں بتا دو" ___ میں نے کہا۔
"مجھ کو معلوم ہے کہ تم الطاف کے ساتھ گھر سے بھاگ جانا چاہتی ہو۔"
"نہ جی!" ___ اُس نے بڑے اطمینان سے بغیر کسی ردِ عمل کے کہا۔
"الطاف کیا چیز ہے، میں تو مشتاق کے ساتھ جانا چاہتی ہوں" ___ یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی۔
میں نے اتنے سے اشارے سے ہی سمجھ لیا کہ یہ لڑکی ذہنی مریض ہے۔ میں نے اُس پر سیدھے سوال کرنے شروع کر دیے۔
"اچھا یہ بتاؤ فاطمہ!" ___ میں نے پوچھا ___ "ان دونوں میں سے یہ واردات کس نے کرائی ہے۔"
"اللہ جانے!" ___ اُس نے ہنستے ہوئے کہا ___ "میرا خیال ہے کہ خدا نے میری دُعا قبول کر لی ہے..... میں دُعا کیا کرتی تھی کہ مشتاق کے ساتھ میری شادی نہیں ہوتی تو اللہ کرے کہ جو زیور اور کپڑے میرے واسطے بنے ہیں ان کو آگ لگ جائے یا چور لے جائیں۔"
مجھ کو یہ شک ہوا کہ یہ لڑکی دانستہ پاگل نہ بنی ہوئی ہو لیکن یاد آ گیا کہ نمبردار اور ذیلدار نے بتایا تھا کہ لڑکی بچپن سے ہی ایسی ہے۔ ایسی لڑکی سے مجھ کو کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کے پاگل پن کو ہی استعمال کروں۔ اُس وقت تک میں اتنا تجربہ کار تو نہیں ہوا تھا لیکن انسانوں کی نظریں اور ان کے چہرے کسی حد تک پڑھ لیا کرتا تھا۔ فاطمہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ کو دیکھتی تھی اور میں محسوس کرتا تھا کہ اُس کی آنکھوں میں پیاس اور طلب سی ہے۔ قدرتی بات ہے کہ اُس کے ماں باپ اور بھائی وغیرہ اس کو پگلی سمجھ کر اس کے ساتھ اچھی طرح نہیں بولتے ہوں گے اور یہ اگر عقل کی بات کر بیٹھے تو اس بات کو بھی رد کر دیتے ہوں گے۔ میں نے اس کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔
"فاطمہ!" ___ میں نے کہا ___ "اگر میں تمہاری شادی مشتاق کے ساتھ کرا دوں تو کیا انعام دو گی؟"
وہ کچھ دیر میرے منہ کی طرف دیکھتی رہی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ

تھی۔ پھر بولی ـــ "آپ شادی شدہ ہیں؟"

"مجھ کو گولی مارو فاطمہ!" ـــ مَیں نے کہا ـــ "میں تمہاری شادی کی بات کر رہا ہوں۔"

"ہائے اللہ!" ـــ اُس نے کہا ـــ "گولی کیوں ماروں! اتنے خوبصورت آدمی ہیں آپ!"

"ہاں بتاؤ میں نے جو پوچھا تھا" ـــ مَیں نے کہا ـــ "مشتاق کے ساتھ شادی کرا دوں؟"

"کرا دیں" ـــ اُس نے کہا ـــ "اور بتائیں کیا انعام لینا ہے۔"

"مجھ کو یہ انعام چاہیئے کہ یہ بتا دو کہ تمہارا مال کس نے چوری کیا ہے۔"

"مجھ کو کیا پتہ!" ـــ اُس نے کہا ـــ "پتہ لگتا تو میں شور مچا دیتی اور وہ پکڑے جاتے۔"

میں نے بہت کوشش کی کہ وہ پاگل پن میں ہی راز کی کوئی بات اُگل دے لیکن وہ کوئی بات سنجیدگی سے نہیں سنتی تھی اور اُس کے گھر کا جو اتنا نقصان ہُوا تھا اُس کی بابت بھی وہ سنجیدہ نہیں تھی۔ اُس کو تو پرواہ ہی نہیں تھی کہ اُس کے گھر میں اتنی سنگین واردات ہُوئی ہے۔ وہ صرف اپنے اس سوال پر سنجیدہ تھی جو اُس نے چار دفعہ مجھ سے پوچھا ـــ "کیا آپ شادی شدہ ہیں؟" ـــ مَیں نے اُس کے سوال کا جواب دیا ہی نہیں۔

مَیں نے جب اُس سے کہا کہ وہ اپنے باپ کے پاس چلی جائے تو ایسے لگا جیسے اُس نے سُنا ہی نہیں۔ دوسری دفعہ کہنے پر وہ اُٹھی اور باہر نکلنے کی بجائے میز سے گھوم کر میری طرف آئی۔ اُس نے میرے سر پہ ہاتھ رکھا۔ میں سَر سے ننگا تھا۔ ذرا دیر میرے سر پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ میں نے اُس کو منع نہ کیا۔ مَیں اُس کے ذہن کی حالت کو جانتا تھا۔ مَیں اُٹھا اور اُس کا بازو پکڑ کر آرام آرام سے اُس کو دروازے کی طرف لے چلا۔ دروازے میں جا کر اُس کو پھر کہا کہ وہ اپنے باپ کے پاس چلی جائے۔ اُس نے مجھ کو پیاسی سی نظروں سے دیکھا اور اس طرح چل پڑی جیسے وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔

میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ لڑکی ذہنی لحاظ سے بالکل ٹھیک نہیں

کہیں ایسا نہ ہُوا ہو کہ اُس نے اسی پاگل پن میں اپنے کسی چاہنے والے کے واسطے گھر بھیدی کا کام کر دکھایا ہو۔

اُس وقت میرے پاس قتل کی دو اور ڈکیتی کی تین وارداتوں کی تفتیش تھی۔ اے۔ ایس۔ آئی کے پاس بھی بہت کام تھا۔ مَیں نے نقب زنی کی ان وارداتوں کی تفتیش اپنے جونیئر سب انسپکٹر کے حوالے کر دی۔ وہ ہندو راجپوت تھا۔ تفتیش اور سُراغ رسانی بڑی محنت سے کرتا تھا۔ کھاتا بہت تھا۔ مقتول کے گھر سے بھی وصول کر لیا کرتا تھا۔ اُس نے اُسی روز تفتیش شروع کر دی۔

تقریباً ایک مہینہ گزر گیا۔ ملزموں کا کوئی سُراغ نہ ملا۔ ایک روز پہلی واردات والے گھر کے تین آدمی تھانے میں آئے۔

"آپ کو ایک اشارہ دینے آئے ہیں" ــــ ان میں سے ایک نے کہا۔ اُس نے پچیس میل دُور کے ضلعی شہر کا نام لے کر کہا ــــ "آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ ہماری بیٹی کی شادی ہو رہی ہے اور جو کپڑے اور زیور چوری ہوئے ہیں وہ ہم نے اپنی بیٹی کے لیے بنائے تھے۔ لڑکے والے کہہ رہے تھے کہ مال کی واپسی تو مشکل نظر آتی ہے، کسی طرح شادی جلدی ہو جانی چاہیے۔ اللہ نے ہمیں بہت دیا ہے۔ ہم نے سوچا کہ شادی کو اور زیادہ نہ ٹالا جائے۔ ہم شہر زیور بنوانے کے لیے چلے گئے۔ کچھ اور چیزیں بھی خریدنی تھیں۔ میری بیوی میرے ساتھ تھی۔ اُس کی ایک بہن اور اُس کا خاوند بھی ساتھ تھے۔ ہم سُنار کی دُکان پر بیٹھے ہوئے زیور کے نمونے دیکھ رہے تھے....

"ایک آدمی ایک جوان لڑکی کے ساتھ دکان میں داخل ہُوا۔ لڑکی نے بڑے قیمتی ریشمی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ آدمی نے لٹھے کی شلوار اور قمیض پہنی ہوئی تھی۔ اُس کے سر پر طرّے والی پگڑی تھی۔ سُنار ہمیں چھوڑ کر فوراً اُن کی طرف گیا۔ اُس آدمی نے ہاتھ شیشے (شوکیس) کے اوپر سے آگے کر کے نیچے کیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اُس آدمی کے ہاتھ میں چھوٹی سی تھیلی تھی جو سُنار نے اُس کے ہاتھ سے پکڑ لی۔ سُنار پیچھے والے کمرے میں چلا گیا....

"میری بیوی لڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس نے مجھ کو آہستہ سے کہا ـــ "یہ نگو تو نہیں؟" ـــ اب مَیں نے لڑکی کو غور سے دیکھا تو وہ واقعی نگو تھی جو تین مہینے سے کچھ زیادہ عرصہ گزرا گاؤں سے لاپتہ ہوگئی تھی۔ میری بیوی نے اُس کو آواز دی۔ نگو نے ہماری طرف دیکھا اور ہماری طرف آنے کی بجائے اپنے ساتھ کے آدمی کو کچھ کہا اور دونوں بڑی جلدی میں دکان سے نکل گئے....

"میری سالی کے خاوند نے کہا کہ وہ اس آدمی کو جانتا ہے اور یہ آدمی اچھی شہرت والا نہیں۔ شاید ہمارے ہی علاقے کا رہنے والا ہے۔ ہم دونوں باہر نکلے تو دیکھا کہ وہ آدمی اور نگو تانگے پر بیٹھ رہے تھے اور تانگہ چل پڑا تھا۔"

اس شخص کی سالی کا خاوند بھی ساتھ آیا تھا۔ مَیں نے اُس سے پوچھا کہ وہ آدمی کون تھا۔

"مَیں اُس کا نام نہیں جانتا جناب!" ـــ اُس نے کہا ـــ "ایک بار ایک جگہ اُس کو دیکھا تھا۔ میرے ایک دوست نے مجھ کو بتایا تھا کہ یہ شخص جو اتنا معزز جوان لگتا ہے مانا ہوا رہزن اور ڈکیت ہے۔"

تھانے میں اُن مجرموں کے فوٹو موجود رہتے ہیں جو اشتہاری ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض کا انعام بھی مقرر ہوتا ہے۔ مَیں نے اس آدمی کو فریم میں اکٹھے لگے ہوئے فوٹو دکھائے اور کہا کہ جس شخص کو اُس نے دیکھا ہے کیا اُس کا فوٹو ان میں موجود ہے؟ اُس نے تمام فوٹو دیکھے اور کہا کہ اُس کا فوٹو ان میں نہیں ہے۔ مَیں نے اُن سے پوچھا کہ وہ لڑکی کب اور کس گاؤں سے غائب ہوئی تھی۔ اُنہوں نے مجھ کو یاد دلایا کہ لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ تھانے میں آئی تھی لیکن آپ نے معلوم نہیں کیا کہا تھا کہ کوئی تفتیش نہیں ہوئی تھی

مجھ کو یاد آگیا کہ تین مہینے کے لگ بھگ عرصہ گذرا نقب زنی کی واردات والے گاؤں کی ایک لڑکی لاپتہ ہوگئی تھی۔ وہ کوئی چھوٹی ذات کی لڑکی حسین تھی لیکن اس کی ذات اتنی اونچی بھی نہیں تھی۔ درمیانہ

سے درجے کے لوگ تھے۔ گمشدگی کی رپورٹ دینے کے واسطے لڑکی کا باپ اور اُس کا چچا آیا تھا۔ انہوں نے لڑکی کا نام نگار بی بی بتایا تھا۔ اُس کو گاؤں میں نگو کہتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ لڑکی رات کو گھر میں سوئی تھی۔ صبح اُٹھ کے دیکھا۔ وہ غائب تھی۔ مَیں نے اُن سے نگو کی عمر پوچھی تو انہوں نے بیس اکیس سال بتائی تھی۔

مَیں نے اُن کو کہا تھا کہ اُن کو کسی پر شک ہے تو بتائیں اور اگر اُن کو یہ شک ہے کہ لڑکی کو زبردستی اغوا کیا گیا ہے تو بھی بتا دیں پھر میں لڑکی کو زندہ یا مُردہ ڈھونڈ نکالوں گا۔ انہوں نے کوئی بھی شک ظاہر نہ کیا۔ مَیں نے دیکھا کہ لڑکی کا باپ اور چچا ڈھیلی ڈھیلی باتیں کر رہے تھے۔ وہ نمبردار کو ساتھ نہیں لائے تھے۔ اُن سے پوچھا کہ وہ نمبردار کو کیوں ساتھ نہیں لائے تو لڑکی کے باپ نے کہا کہ وہ در پردہ تھانے آئے ہیں۔ وہ اپنی بے عزتی سے ڈرتے تھے۔ اُن کو یہ اُمید تھی کہ گاؤں میں اُن کی لڑکی کی گمشدگی کا کسی کو پتہ ہی نہیں لگے گا۔ اس سے مجھ کو یقین ہو گیا کہ ان کو معلوم ہے کہ لڑکی کسی کے ساتھ نکل گئی ہے اور یہ محض رسمی طور پر رپورٹ لکھوانے آئے ہیں۔

میں نے لڑکی کے چچا کو کہا کہ اپنے گاؤں جائے اور نمبردار اور چوکیدار کو ساتھ لے آئے۔

نمبردار اور چوکیدار گھوڑیوں پر اڑھائی تین گھنٹے بعد آئے۔ مَیں نے نمبردار سے گمشدہ لڑکی کی بابت پوچھا۔

"بدمعاش ماں کی بیٹی ہے" — نمبردار نے کہا — "سارا گاؤں گواہی دے گا کہ لڑکی کی ماں پکّی فریب کار ہے۔ اللہ نے اُس کو حسن دیا ہے اور تین بیٹیاں دی ہیں۔ بیٹا کوئی نہیں۔ نگو سب سے بڑی لڑکی ہے۔ ماں سے زیادہ خوبصورت نکلی ہے۔ وہ خود کسی کے ساتھ گئی ہو گی اور ماں کو پورا پتہ ہو گا۔"

"باپ کیسا آدمی ہے؟" — مَیں نے پوچھا۔

"مُردہ ہے" — نمبردار نے جواب دیا — "ایسے سمجھو کہ اس عورت نے اُس کو مُردہ کر دیا ہے۔ بیوی کے آگے دب گیا ہے" — نمبردار

نے نگو کی ماں کے چال چلن کی بہت سی باتیں سنائیں۔

"آپ کی بیٹی لاپتہ ہو گئی ہے" ــــــ میں نے نگو کے باپ اور چچا کو الگ بٹھا کر کہا ــــ "اُس کو ڈھونڈنا میرا فرض ہے۔ میں آپ کو ٹالوں گا نہیں، لیکن یہ سوچ لو کہ لڑکی کی عمر اکیس سال ہے۔ وہ چھوٹی سی بچّی نہیں تھی کہ اُس کو کوئی اُٹھا کر لے گیا ہو گا۔ میں اُس آدمی کو پکڑ لوں گا جس کے ساتھ وہ گئی ہے۔ اگر لڑکی نے عدالت میں یہ کہہ دیا کہ میں بالغ ہوں اور خود اس شخص کے ساتھ شادی کر لی ہے تو آپ کی کیا عزت رہ جائے گی؟ آپ کو اپنے گھر کے حالات معلوم ہی ہیں"۔

نگو کے باپ نے کہا کہ وہ رپورٹ نہیں دینا چاہتا تھا۔ چچا نے بھی کہا کہ جانے دو جدھر گئی ہے۔ میں نے اُن کو پھر بھی کہا کہ وہ کہتے ہیں تو میں رپورٹ لکھ کر تفتیش شروع کر دوں گا لیکن وہ میری بات سمجھ گئے تھے۔ وہ چلے گئے۔

اب تین مہینوں بعد میں نگو کا نام سن رہا تھا۔ لاپتہ ہونے کے تین ماہ بعد نگو کا کہیں نظر آنا میری دلچسپی کا واقعہ نہیں تھا۔ میرے کان یہ سن کر کھڑے ہوئے کہ نگو کے ساتھ جو آدمی تھا اُس کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ دوسری بات یہ کہ اس آدمی نے سنار کو ہاتھ نیچے کر کے، یعنی دوسروں سے چوری ایک گٹھڑی دی جو سنار لے کر پچھلے کمرے میں چلا گیا۔ تیسری بات یہ کہ نگو نے اپنے گاؤں کے دو آدمیوں اور دو عورتوں کو دیکھا تو وہ گھبرا گئی پھر اُس نے اپنے ساتھ کے آدمی سے کچھ کہا اور دونوں بڑی تیزی سے باہر نکل گئے اور چوتھی بات یہ کہ کسی نے کہا تھا کہ یہ آدمی کتنا معزز لگتا ہے لیکن رہزن اور ڈکیت ہے۔

اگر وہ تھیلی مشکوک نہ ہوتی تو وہ آدمی اس طرح چھپا کر سنار کو کیوں دیتا؟ میرے ذہن میں یہ شک بیٹھ گیا کہ اس گٹھڑی میں چوری کا مال زیور ہی ہو سکتا تھا، لیکن یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ نقب زنی کی ان وارداتوں کا زیور تھا۔

یہ جو دو آدمی یہ خبر لائے تھے، انہوں نے میرے ذہن میں ایک

اور ٹسک اس طرح ڈال دیا کہ ان کی عورتیں کہتی تھیں کہ نگو نے جو کپڑے پہنے ہوئے تھے وہ اُن کی بیٹی کے معلوم ہوتے تھے ۔ یہ خاص قسم کے کپڑے کا جوڑا تھا ۔ اُس زمانے میں سُوتی کپڑا عام استعمال ہوتا تھا ۔ روپے پیسے والے لوگوں کی عورتیں ریشمی کپڑے خاص موقعوں پر پہنتی تھیں میں دیہات کی بات کر رہا ہوں ۔ آج کل تو کیا امیر کیا غریب سے کے ٹی اور نائلون وغیرہ کے کپڑے پہنتے ہیں ۔ اُس زمانے میں سوتی کپڑا نہایت اچھا ہوتا تھا ۔ دیہات میں جہیز میں زیادہ جوڑے اچھی قسم کی کاٹن کے رکھے جاتے تھے ۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ جن گھروں میں نقب لگی تھی وہ امیر لوگوں کے گھر تھے ۔ وہ باہر کے ریشم کے قیمتی کپڑے خرید سکتے تھے ۔

❦

میں نے اُن سے تفصیل پوچھی تو مجھ کو ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کی عورتوں کے ساتھ گفتگو کی جائے ۔ میں نے ان کو کہا کہ وہ اپنی دونوں عورتوں کو تھانے لے آئیں ۔

ان کے آنے تک میں نے بذریعہ ٹیلیفون علاقہ ڈی ایس پی کے ساتھ بات کر لی کہ مجھ کو شاید ضلع کے شہر میں ایک سنار کی دکان کی تلاشی اور سُنار کو شاملِ تفتیش کرنے کے واسطے جانا پڑے ۔ میں نے اُن کو ساری بات سنائی ۔ اس کام کی تھوڑی سی کاغذی کارروائی ہونی تھی ۔ وہ انگریزوں کا زمانہ تھا ۔ سُرخ فیتے کا رواج نہیں تھا ۔ دفتری کارروائیاں تیزی سے ہوتی تھیں ۔ نقب زنی ، ڈکیتی اور قتل جیسی سنگین وارداتوں کی تفتیش میں دفتری اور کاغذی کارروائیوں کو رکاوٹ نہیں بننے دیا جاتا تھا ۔

دفتری اور کاغذی کارروائیوں کے ساتھ آپ کو دلچسپی نہیں ہونی چاہیئے ۔ میں آپ کو دلچسپ واقعہ سُنا رہا ہوں ۔ وہ عورتیں آئیں تو میں نے دونوں کو اکٹھے بٹھا لیا ۔ آپ جانتے ہوں گے کہ عورت عورت کو بڑی گہری نظروں سے دیکھا کرتی ہے ۔ عورتیں سب سے پہلے ایک دوسری کے کپڑے پھر پہنا ہوا زیور دیکھتی ہیں ۔ اس کے بعد وہ دیکھتی ہیں کہ یہ کون ہے اور وہ کون ہے ۔ میں نے ان دونوں عورتوں سے نہایت چھوٹی چھوٹی اور بہت ہی باریک باتیں پوچھیں ۔ وہ جوں جوں میرے سوالوں

کے جواب دیتی جا رہی تھیں۔ میرے ذہن میں شکوک پختہ ہوتے جا رہے تھے اور میری سُراغ رسانی والی رگ پھڑکنے لگی تھی۔

میں آپ کو سارے سوال اور اُن کے جواب نہیں سناؤں گا۔ ان سے میں نے جو معلومات حاصل کیں وہ یہ تھیں کہ انہوں نے نگو کا چہرہ بعد میں دیکھا تھا۔ وہ اُس کو شہر کی لڑکی بلکہ ہندوؤں کی لڑکی سمجھی تھیں۔ جب چہرہ دیکھا تو وہ نگو جیسا تھا۔ اُس کا رنگ پہلے سے زیادہ گورا تھا۔ گاؤں میں معمولی سے کپڑے پہنا کرتی اور اُس کے چہرے پر یہ رونق نہیں ہوا کرتی تھی۔ غور سے دیکھا تو وہ نگو ہی نکلی۔

اُس نے جو کپڑے پہنے ہوئے تھے وہ ان عورتوں کو اپنے لگے یا ان جیسے لگے۔ انہوں نے دوپٹہ خاص طور پر پہچانا۔ اس پر انہوں نے میرے تھانے والے قصبے کے ایک کاریگر سے کڑھائی کرائی تھی۔ ایسی ہی انہوں نے دو تین اور نشانیاں بتائیں۔

میں ایسا اناڑی تو نہیں تھا کہ کپڑوں کی نشانیوں پر ہی چل پڑتا۔ کپڑا جو بازار میں آتا ہے وہ کتنا ہی مہنگا کیوں نہ ہو، پیسے والے لوگ خریدتے اور پہنتے ہیں۔ اس طرح ایک کپڑا کئی لوگوں کے جسموں پر نظر آتا ہے۔ البتہ دوپٹے کی کڑھائی پر غور کیا جا سکتا تھا۔ مجھ کو خیال آگیا کہ نگو نے گھر بھیدی کا کام نہ کیا ہو۔

"کیا نگو تمہارے گھر آتی تھی؟"

"آتی تھی" ـــــ ایک عورت نے جواب دیا ـــــ "میری بیٹی کے پاس دیر تک بیٹھتی تھی۔"

"وہ تو ہر گھر میں جاتی تھی!" ـــــ دوسری عورت نے کہا ـــــ "ہنسنے کھیلنے اور خوش رہنے اور ہنسانے والی لڑکی تھی۔"

"کیا تم نے اس کو کبھی اپنی بیٹی کا زیور اور کپڑے وغیرہ دکھائے تھے؟"

"بالکل دکھائے تھے" ـــــ لڑکی کی ماں نے جواب دیا ـــــ "میری بیٹی نے ٹرنک کھول کر ایک ایک چیز دکھائی اور اُس کے سامنے ٹرنک میں رکھی تھی پھر دونوں لڑکیوں نے ٹرنک اٹھا کر ٹرنکوں پر رکھا تھا۔ یہ تو میں

نے خود دیکھا تھا۔"

"نگو کیسی لڑکی ہے؟"

"ماں کی وجہ سے بدنام تھی" ــــ لڑکی کی ماں نے بتایا ــــ "اُس کی ماں تو اب بھی مردوں کے ساتھ دوستیاں لگانے سے باز نہیں آتی۔ اس عورت کا وطیرہ بہ رہا ہے کہ بیٹی کے رشتے کا کسی کے ساتھ وعدہ کر کے اُس کی جیب خالی کر لیتی ہے پھر اُس کو جواب دے کر رشتے کا وعدہ کسی اور کے ساتھ کر دیتی ہے۔ وہ خود بھی اور اُس کی بیٹیاں بھی خوبصورت ہیں۔ اس وجہ سے مرد اُس کے جال میں آجاتے ہیں۔"

"نگو کا چال چلن کیسا تھا؟"

"گاؤں میں لوگ باتیں تو بہت کرتے تھے لیکن اپنی ماں کی طرح خراب نہیں تھی" ــــ لڑکی کی خالہ نے جواب دیا۔

"میرے بیٹے پر اُس نے جادو چلا لیا تھا" ــــ لڑکی کی ماں نے کہا۔ "میرا بیٹا کہتا تھا کہ نگو کے ساتھ ہی شادی کروں گا۔ مَیں نے تو اپنے پیر صاحب سے تعویذ لکھوا کر اپنے بیٹے کو پلائے تھے۔ ان کا یہ اثر ہوا کہ نگو کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔"

مجھ کو نگو کے چال چلن اور حسن کے ساتھ دلچسپی نہیں تھی۔ میں صرف یہ دیکھ رہا تھا کہ وہ گھر بھیدی بنی ہو گی یا نہیں۔ کبھی تو مجھ کو خیال آتا کہ میں ہوا میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں لیکن یہ بات کہ اُس آدمی نے سنار کو چوری چھپے تھیلی دی تھی، مجھ کو مجبور کرتی تھی کہ سنار کو شاملِ تفتیش کیا جائے۔ مَیں نے اگلی صبح کی گاڑی سے شہر جانے کا انتظام کر لیا۔

❦

میرے ساتھ اپنے دو کانسٹیبل تھے اور ایک ہیڈ کانسٹیبل۔ جس لڑکی کے گھر نقب لگی تھی اُس کے باپ کو اور اُس کی سالی کے خاوند کو راہنمائی کے واسطے ساتھ لے لیا تھا۔ میں پہلی گاڑی سے نکل گیا اور جب اُس شہر پہنچ کر سنار کی دُکان تک گئے تو دُکان کھل چکی تھی۔ ایک تھانیدار اور دو کانسٹیبلوں کو دیکھ کر دکاندار کا رنگ بدل گیا۔ مجھ کو بتایا گیا کہ اس آدمی

نے اس شخص کو تھیلی دی تھی۔

یہ بڑی دکان تھی۔ آج کل کی جیولری کی دکانوں کی طرح اس کا شیشوں والا کاؤنٹر تھا۔ سنار کی تو زبان ہی بند ہو گئی تھی۔

"گھبرائیں نہیں لالہ جی!" ___ میں نے اُس کو کہا۔ وہ ہندو تھا ___ "آپ چھوٹا سا ایک کام کر دیں..... کل ایک آدمی ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ آیا تھا۔ وہ آپ کو ایک تھیلی..... چھوٹی سی ایک تھیلی دے گیا تھا۔ آپ وہ تھیلی مجھ کو دے دیں لیکن میں تھیلی خالی نہیں لوں گا۔"

"نہیں انسپکٹر صاحب!" ___ اُس نے کہا ___ "مجھ کو کوئی تھیلی نہیں دے گیا۔ آپ کو شاید....."

"لالہ جی!" ___ میں نے اُس کو آگے بولنے نہ دیا ___ "کیا آپ کو معلوم ہے کہ پولیس کسی مکان یا دکان کی تلاشی کس طرح لیا کرتی ہے؟ میں جب تلاشی لے رہا ہوں گا تو سارا بازار تماشہ دیکھنے آ جائے گا۔ ایک ڈکیت کے ساتھ گرفتار ہونا چاہتے ہو؟ میں اور زیادہ مہلت نہیں دوں گا۔"

اُس نے آہ بھری اور سر کا اشارہ کیا کہ اندر آؤ۔ وہ پچھلے کمرے کی طرف چلا تو میں کاؤنٹر سے گھوم کر اُس کے پیچھے چلا گیا۔ وہ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ تین چار آدمی جو اُس کے کاریگر تھے، فرش پر بیٹھے کام کر رہے تھے۔ سنار نے اُن کو باہر جانے کے لیے کہا۔ میں نے اُن کو کہا کہ وہ کاؤنٹر سے باہر نہ جائیں۔

"انسپکٹر صاحب!" ___ سنار نے کہا ___ "بتائیے کیا خدمت کروں..... جو فرمائیں گے پیش کروں گا۔"

وہ شہر کا جیولر تھا۔ میں اس سے بے شمار رشوت لے سکتا تھا لیکن رشوت ہضم کرنا ذرا مشکل تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں شریف اور دیانتدار آدمی تھا بلکہ وجہ یہ تھی کہ میرے اوپر جو افسر تھے وہ دیانتدار تھے۔ نقب زنی کی یکے بعد دیگرے دو وارداتوں نے اوپر والوں کو پریشان کر دیا تھا۔ وہ روز بروز دیکھ رہے تھے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ آج کل ہر علاقے میں چوبیس گھنٹوں میں اتنی سنگین وارداتیں ہو جاتی ہیں تو نہ اوپر والوں کو پریشانی ہوتی ہے نہ نیچے والوں کو بلکہ اوپر نیچے والوں کی چاندی ہو جاتی ہے۔

اس ہندو سنّار کا رشوت پیش کرنا دراصل اقبالِ جرم تھا، یعنی اُس نے تسلیم کر لیا تھا کہ اُس کے پاس چوری کا زیور آیا ہے۔ مَیں نے اُس کو کہا کہ وہ تھیلی اور مال میرے حوالے کر دے اور مال لانے والے کو پکڑوا دے پھر مَیں اُس کو کیس سے نکال دوں گا۔ مَیں نے اُس کو یہ تاثر دیا کہ مَیں رشوت قبول کر لوں گا۔"

وہ تھیلی لانے کے واسطے چلا تو مَیں نے اُس کو روک دیا۔ باہر جا کر تماشائیوں میں سے دو آدمی پکڑے اور ان کو اندر لے گیا۔ سنّار سے کہا کہ وہ تھیلی مجھ کو نکال دے۔ وہ دو گواہوں کو دیکھ کر گھبرایا لیکن مَیں نے جھوٹ موٹ کی دلیلوں اور وعدوں سے اُس کی تسلی کر دی۔ اُس نے ایک صندوقچی میں سے تھیلی نکال دی جو خالی تھی۔

میں نے خالی تھیلی کا مشیر نامہ تحریر کیا اور دونوں گواہوں کے دستخط کرا کے تھیلی اپنے قبضے میں لے لی اور دونوں گواہوں کے نام اور پتے لکھ کر اُن کو بتایا کہ انہوں نے عدالت میں یہ گواہی دینی ہو گی کہ تھیلی سنّار نے خود برآمد کرائی تھی۔ ان کو مَیں نے فارغ کر کے سنّار سے کہا کہ اب وہ بتائے کہ اس تھیلی میں کیا تھا۔

"انسپکٹر صاحب!" — اُس نے کہا — "آپ نے باہر کے دو آدمی اندر لا کر مجھ کو ذلیل کر دیا ہے۔"

"لالہ جی!" — مَیں نے کہا — "اگر آپ میرے ساتھ ہیرا پھیری کریں گے تو مَیں آپ کو ہتھکڑی لگا کر بازار میں سے گزاروں گا۔ مَیں نے آپ کو کہہ دیا ہے کہ جیسے مَیں کہتا ہوں ویسے کرتے رہیں۔"

"لالہ جی نے مجھ سے تھوڑی سی جھک جھک کرائی پھر اصل بات منہ سے نکالی۔ اُس نے تھیلی لانے والے کا نام عبدالواحد بتایا لیکن اُس کو اس شخص کا اتا پتہ معلوم نہیں تھا۔ عرصہ تین سال سے یہ عبدالواحد اس سنّار کو چوری کا زیور دے رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ سنّار کو یہ زیور سستا ملتا تھا۔

"کل وہ پھر زیور لایا تھا" — سنّار نے مجھ کو بیان دیتے ہوئے کہا — "میرے پاس گاہک بیٹھے ہوئے تھے۔ عبدالواحد کے ساتھ ایک لڑکی تھی۔

گاہکوں نے شاید عبدالواحد کو پہچان لیا تھا۔ میں اُس کے پاس گیا۔ اُس نے یہ تھیلی میرے حوالے کی اور چلا گیا"۔

"بعد میں رقم لینے آیا تھا؟" ـــــ میں نے پوچھا۔

"نہیں" ـــــ ہندو جیولر نے جواب دیا ـــــ "اُس نے آہستہ سے کہا تھا کل آؤں گا۔ وہ آج کسی وقت آئے گا"۔

میں نے اُس کا آگے بیان نہ لیا اور باہر آکر تماشائیوں کو کہا کہ وہ فوراً یہاں سے چلے جائیں ورنہ ڈنڈے برساؤں گا۔ اپنے ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبلوں کو کہا کہ وہ علاقے کے تھانے میں چلے جائیں۔ اپنے ساتھ جن دو آدمیوں کو میں لایا تھا اُن کو بھی ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ بھیج دیا۔

دُکان میں سُنار کا ایک بیٹا بھی آگیا تھا۔ پتہ لگا کہ وہ بھی باپ کے ساتھ دکان پر رہتا ہے۔ میں نے اُس کو کہا کہ وہ دُکان میں موجود رہے اور کوئی گاہک آئے تو باپ کو اندر سے بُلا لے۔ دُکان کے کاریگروں کو کہا کہ وہ دُکان میں موجود رہیں اور اندر کمرے میں نہ آئیں۔

"اور آپ لالہ جی! اندر میرے ساتھ کمرے میں رہیں" ـــــ میں نے سُنار کو کہا ـــــ "کسی گاہک کے آنے پر آپ کا بیٹا آپ کو بُلائے گا تو آپ باہر نکلیں۔ بھاگنے کی نہ سوچ لینا لالہ جی! دُکان بمع مال بحق سرکار ضبط ہو جائے گی۔ اگر عبدالواحد آئے تو اُس کو رقم دینے کے واسطے اندر لے آئیں۔ اُس کو گرفتار کرا دیں پھر آپ کو چھٹی"۔

وہ خوش ہو گیا۔ میں نے اُس کا بیان لینا شروع کر دیا۔ تھیلی میں عبدالواحد زیور لایا تھا۔ سُنار چوری کا زیور خریدیں یا کسی کا اپنا زیور خریدیں، اس کو وہ فوراً توڑ دیتے ہیں۔ یہ زیور چوری کا تھا اس وجہ سے اس سُنار نے اس کو توڑ کر پگھلا دیا تھا۔ میں نے یہ زیور جواب صرف سونا تھا، برآمد کرنا تھا۔ عبدالواحد کی بابت وہ اور کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

میں سُنار کے ساتھ سوال جواب میں لگا رہا اور سوچتا رہا کہ میرا یہ پھندہ کامیاب ہو گا یا نہیں اور کیا یہ زیور نقب زنی کی وارداتوں والا ہو گا یا کسی

اور واردات کا۔

تین گھنٹے گزر گئے۔ اس دوران چار گاہک آئے۔ سُنار بیٹے کے بلانے پر باہر گیا اور واپس آ گیا۔ آخر ایک اور گاہک کی اطلاع ملی۔ سُنار باہر گیا اور مجھے دُکان سے آوازیں سُنائی دیں۔

"آؤ عبدالواحد بھائی! ــــ یہ سُنار کی آواز تھی ــــ "اندر آ جاؤ۔ کل تم آئے اور گئے۔"

"بہت جلدی تھی لالہ!" ــــ یہ عبدالواحد کی آواز ہو سکتی تھی۔

کمرے کا دروازہ کھلا۔ پہلے لالہ اندر آیا۔ اُس کے پیچھے ایک دراز قد آدمی تھا۔ لباس اور ڈیل ڈول سے معزز دیہاتی لگتا تھا۔ مجھ کو دیکھ کر وہ جھجکا اور اُس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ بھاگ نکلنے کا راستہ دیکھ رہا تھا میں بڑی تیزی سے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔

"یہ کیا لالہ؟" ــــ اُس نے سُنار سے پوچھا۔

سُنار نے کچھ نہ کہا۔

"ایسا وقت بھی آ جاتا ہے عبدالواحد" ــــ مَیں نے کہا ــــ "لالہ جی کے بیان ہو چکے ہیں۔ مَیں تمہارے انتظار میں بیٹھا تھا۔"

"جانے دو جی!" ــــ عبدالواحد نے مجھ کو کہا ــــ "بات کرو اور ابھی ڈیل کر دو..... مَیں وصولی کے واسطے آیا ہوں۔ ساری رقم رکھ لو۔"

مَیں نے ہتھکڑی اپنے پاس رکھ لی تھی۔ عبدالواحد ہتھکڑی نہیں لگوا رہا تھا۔ وہ منتیں کرتا اور رشوت پیش کرتا تھا۔ سُنار نے بھی اُس کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ مَیں نے آخر ہتھکڑی لگا دی۔ دکاندار کے لڑکے کو تھانے بھیجا کہ میرے تمام آدمیوں کو دُکان میں لے آئے۔

"لالہ جی!" ــــ مَیں نے کہا ــــ "اب زیور برآمد کرا دو۔"

مَیں نے پھر دو آدمی بلائے اور سُنار نے پگھلے ہوئے زیور کا ایک ٹکڑا برآمد کرا دیا۔ اتنے میں میرے آدمی آ گئے۔ سُنار نے ہنگامہ تو اُس وقت برپا کیا جب میں اُس کو ہتھکڑی لگانے لگا۔ وہ ہتھکڑی کے بغیر تھانے جانا چاہتا تھا لیکن ہتھکڑی ضروری تھی جو مَیں نے اُس کو لگوا دی۔

دونوں کو شہر کے اس علاقے کے تھانے میں لے گئے اور کاغذوں کا پیٹ بھر کے اور ضابطے کی کارروائیاں کر کے دونوں ملزموں کو میں بذریعہ ریل گاڑی اپنے قصبے میں لے آیا۔ میں نے یہ کیس اپنے جونیئر سب انسپکٹر کو دیا ہوا تھا لیکن کیس ایسے سٹیج پر آ گیا تھا کہ میں نے اس کو اپنے ہاتھ میں ہی رکھنا بہتر خیال کیا۔

ستار مجھ کو بیان دے چکا تھا کہ عبدالواحد تین برسوں سے چوری کا زیور اُس کے ہاں بیچ رہا تھا۔ میں نے تفصیل پوچھی تو ستار نے بتایا تھا کہ کبھی وہ ایک دو انگوٹھیاں کبھی جھمکوں کی ایک دو جوڑیاں اور کبھی ذرا زیادہ زیور لاتا تھا۔ ستار نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس دفعہ وہ زیادہ زیور لایا تھا اور اُس نے اس کی تفصیل بھی مجھ کو لکھا دی تھی۔ وہ زیادہ تر انگوٹھیاں ہی لایا کرتا تھا۔ اس سے میں نے یہ رائے قائم کی کہ یہ شخص رہزن ہے جو راستہ روک کر اکیلے دکیلے آدمی کی انگوٹھی یا عورت ساتھ ہو تو اُس کا تھوڑا سا زیور جو اُس نے پہنا ہوا ہوتا ہے اُتروا لیتا ہے۔ اگر یہ نامی گرامی ڈاکو ہوتا تو میں اس سے ضرور واقف ہوتا۔ میں نے اُس کو الگ اپنے پاس بٹھا لیا۔

"دیکھو عبدالواحد!" —— میں نے اُس کو کہا —— "تمہارے سامنے یہی ایک راستہ ہے کہ جُرم کا اقبال کر لو۔"

اُس نے صاف انکار کر دیا۔

"کیا تم نے چوری کا زیور شہر کی اس دُکان پر نہیں بیچا؟" —— میں نے پوچھا۔

"نہیں" —— اُس نے جواب دیا —— "کیا آپ نے مجھ کو زیور بیچتے ہوئے پکڑا ہے؟"

"دیکھو عبدالواحد!" —— میں نے کہا۔

"جناب!" —— اُس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا —— "میرا نام عبدالواحد نہیں۔"

"پھر کیا نام ہے تمہارا؟"

"میرا نام معراج الدین ہے" —— اُس نے جواب دیا۔

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اپنا نام پتہ نہیں بتاؤ گے تو میں تمہیں چھوڑ

دوں گا؟"

"نہ چھوڑیں" ـــــ اُس نے کہا۔

"نگو کہاں ہے؟"

"کون سی نگو؟" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "میں کسی نگو کو نہیں جانتا۔"

"تم کیا سمجھتے ہو کہ میں نگو کو ڈھونڈ نہیں سکوں گا؟" ـــــ میں نے پوچھا۔

"جائیں ڈھونڈ لیں" ـــــ اُس نے جواب دیا۔

یہ آدمی غیر معمولی طور پہ دلیر تو معلوم ہوتا ہی تھا لیکن ڈھیٹ اور بیوقوف بھی لگتا تھا۔ میں نے سنار کو اندر بلا کر اُس کے سامنے بٹھا دیا۔ میں اس سے ان وارداتوں کا بھی اقبالِ جرم کرا سکتا تھا جو اُس نے نہیں کی تھیں۔ یہ تو مجھ کو پتہ لگ گیا تھا کہ جرائم پیشہ ہے۔ میں اس کوشش میں تھا کہ یہ خود ہی اقبالِ جرم کر لے لیکن مجھ کو نظر آ رہا تھا کہ یہ دوسرا طریقہ اختیار کروانا چاہتا ہے۔

میں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اُس نے گرگابی پہنی ہوئی تھی۔ بعد میں کھوجی کو بُلا کر اس کا کھرا دیکھا تو یہ سَو فیصد نقب زنی کی دونوں وارداتوں والا کھرا تھا۔

"لالہ جی!" ـــــ میں نے سنار سے کہا ـــــ "یہ تو مانتا ہی نہیں۔"

"کیوں بھائی!" ـــــ سنار نے اُس سے پوچھا ـــــ "کیا تم تین سال سے میرے پاس زیور نہیں بیچتے رہے؟"

"اپنے مغز کا علاج کرا لالے!" ـــــ اُس نے سنار کو جواب دیا ـــــ "میں تیری دکان پہ زیور خریدنے گیا تھا اور تو نے معلوم نہیں کیوں مجھ کو پولیس کے حوالے کرا دیا ہے۔"

"لالہ جی!" ـــــ میں نے سنار کو ڈرانے کے لیے کہا ـــــ "اس سے اقبالِ جرم کراؤ ورنہ تم رگڑے جاؤ گے۔"

میں چُپ کر کے الگ بیٹھ گیا اور ان دونوں کا تماشا دیکھنے لگا۔ سنار پہلے تو اُس کی منتیں کرتا رہا کہ وہ مان جائے لیکن وہ نہیں مانتا تھا۔

"میری نیکی مت بھولو بھائی!" ـــــ سنار نے اُس کو کہا ـــــ "بازار

میں کوئی سنار چوری کا زیور نہیں خریدتا۔ میں تم سے زیور لیتا رہا اور فوراً پیسے دے دیتا تھا۔"

"یہ کیسی ٹھگی تھی تمہاری؟" ـــ اُس شخص نے سنار کو کہا ـــ "جس بھاؤ پر تم سونا لیتے رہے ہو یہ چاندی کا بھاؤ ہے۔ یہ میں ہی تھا جو تمہیں مال دیتا رہا ہوں۔"

"لوگ چوری کا مال اس سے بھی کم بھاؤ پر لیتے ہیں" ـــ سنار نے کہا۔

"اب سارے بھاؤ برابر ہو جائیں گے" ـــ اُس نے سنار کو کہا۔

میں بڑی زور سے ہنسا اور اُس کو کہا ـــ "تم تو بالکل ہی کچے چور ہو یار! اتنا بھی نہیں جانتے کہ ایک تھانیدار کے سامنے بیٹھے ہوئے تم کیا کہہ رہے ہو۔"

وہ بھی ہنس پڑا اور اُس کی ہنسی ایسی تھی جیسے اُس کو پروا ہی نہیں کہ وہ ملزم ہے اور تھانے میں بیٹھا ہے۔ مجھ کو اچانک ایک خیال آگیا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں ایذا رسانی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میرے دل میں بڑا درد تھا، وجہ یہ تھی کہ ایذا رسانی کے ذریعے جن ملزموں سے اقبالی بیان لیا جاتا ہے وہ عدالت میں جا کر اپنے بیان سے منحرف ہو جاتے ہیں پھر مقدمے کی ناکامی کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہا تھا کہ یہ شخص دوستانہ طریقے سے مان جائے۔ میں نے سنار کو باہر بھیج دیا۔

"تم تو اچھے خاصے جانگلی ہو" ـــ میں نے ملزم کو کہا ـــ "تم نے اپنی زبان سے ثابت کر دیا ہے کہ تم نے کہیں سے زیور چوری کیا ہے اور اس سنار کے پاس بیچا ہے۔ نگو گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہے جو تمہارے قبضے میں ہے تم کہہ سکتے ہو کہ جو زیور تم نے اس سنار کو دیا ہے وہ نگو کا تھا لیکن تم اس سے پہلے چوری کا جو زیور بیچتے رہے ہو اس کا کیا جواب دو گے؟ معلوم ہوتا ہے تم پہلی بار پکڑے گئے ہو۔ یہ تو میں جان گیا ہوں کہ تمہارا پیشہ رہزنی اور ڈکیتی ہے۔ جب تک تم پولیس کے ساتھ بنا کر نہیں

رکھو گے کامیاب نہیں ہو سکو گے۔"

"پولیس سے بنا کر رکھنے سے کیا حاصل ہو گا؟" ـــ اُس نے پوچھا ـــ "آٹھ دس سال کی جیل ہی ملے گی نا!"

"جیل ضرور ملے گی" ـــ میں نے کہا ـــ "میں تم کو ایک راستہ بتاتا ہوں۔ تم کہتے ہو آٹھ دس سال جیل ملے گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آٹھ دس مہینوں میں تمہاری چھٹی کرا دوں گا اور نقد رقم دلاؤں گا۔"

"آپ نے تھانیداروں والی بات کی ہے" ـــ اُس نے کہا ـــ "کیا آپ مجھ کو اپنے پلے سے انعام دیں گے؟"

"نہیں اُلو کے پٹھے!" ـــ میں نے کہا ـــ "تم نے دیکھا ہے یہ لالہ کتنا ڈرا ہوا ہے۔ یہ مجھ کو منہ مانگی رشوت دے رہا ہے جو میں نہیں لے رہا۔ یہ چاہتا ہے کہ اس کا چالان نہ ہو اور یہ تھانے سے ہی کیس سے نکل جائے۔ میں اس کو کہتا ہوں کہ یہ تم کو آٹھ دس ہزار روپیہ نقد دے دے۔ شرط یہ ہے کہ تم اقبالی ہو جاؤ۔ یہ لالہ اتنا ڈرا ہوا ہے کہ میں اس کو کہوں گا کہ وہ تمام زیور جو شروع سے اب تک تم نے اس کو دیا ہے وہ تم کو واپس کر دے یا صحیح بھاؤ لگا کر تم کو رقم دے دے تو یہ اتنی رقم تمہارے قدموں میں رکھ دے گا۔ میں کہتا ہوں کہ تم کو تھوڑی سی سزا ہو جائے تو کچھ نقد رقم بھی مل جائے۔"

"پچاس ہزار دلا دو" ـــ اُس نے کہا۔

میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس وقت کا پچاس ہزار آج کے کم و بیش پندرہ سولہ لاکھ کے برابر تھا۔ ایک عام آدمی پچاس ہزار کو اپنے تصور میں بھی ذرا مشکل سے لاتا تھا۔ میں ہنس پڑا۔

"چلو چالیس ہزار دلا دو" ـــ اُس نے کہا۔

میں بڑی آہستہ آہستہ کرسی سے اُٹھا اور اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔

"کچھ اور کم کرو" ـــ میں نے کہا۔

"نہیں اس سے کم نہیں" ـــ اُس نے جواب دیا۔

میں نے اُس کی طرے دار پگڑی آرام سے اُتار کر پرے پھینک دی۔ اُس کے بال لمبے تھے۔ میں نے اُس کے بال مٹھی میں لیے۔ پوری طاقت

سے جھٹکا دیا اور اوپر کھینچا۔ وہ دانت پیستا ہوا اُٹھا۔ میں نے اُس کا سر آگے کھینچ کر زور سے پیچھے مارا۔ پیچھے دیوار تھی۔ اُس کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ اُس کو دو چار سیکنڈ کے لیے غشی ضرور آئی ہو گی۔ میں نے پروانہ کی۔ بالوں کو پھر آگے کی طرف زور سے جھٹکا دے کر چھوڑ دیا۔ وہ تین چار قدم آگے ہو کر منہ کے بل فرش پر گرا۔ دروازے میں میرا وہ کانسٹیبل آن کھڑا ہوا جس کا کام صرف یہ تھا کہ کھانے پر بیٹھتا تھا تو لگتا تھا جیسے کھانے کے لیے ہی پیدا ہوا ہے۔ جانوروں کی طرح کھاتا تھا اور پتھر جیسے سخت ملزموں سے بھی اقبالِ جرم کرا لیتا تھا۔ میں ایسا سلوک صرف اُن ملزموں کے ساتھ کرایا کرتا تھا جن کی بابت یقین ہوتا تھا کہ یہ مجرم ہیں اور مانتے نہیں۔

"اوئے سانڈا!" ___ میں نے اپنے اس کانسٹیبل سے کہا ___ "لے جا اسے ذرا۔"

کانسٹیبل آگے آیا۔ اُس وقت ملزم فرش سے اُٹھ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ اور گھٹنے ابھی فرش پر تھے۔ کانسٹیبل نے اُس کے پہلو میں لات ماری۔ وہ لڑھکتا ہوا میری میز کے نیچے چلا گیا۔ وہ پیٹھ کے بل پڑا تھا۔ اُس کا ایک ہاتھ میز سے باہر تھا جس کی ہتھیلی اوپر اور اُلٹی طرف فرش پر تھی۔ کانسٹیبل نے اپنا ایک پاؤں ڈیڑھ دو فٹ اونچا اٹھایا اور ہتھوڑے کی طرح بڑی زور سے اُوپر سے پاؤں اُس کی انگلیوں پر مارا۔ ملزم کی ایسی چیخ نکلی جیسے کوئٹے والے ریلوے انجن نے وِسل بجائی ہو۔

"او ٹھہر جاؤ ظالمو!" ___ وہ بلبلایا ___ "ذرا ٹھہر جاؤ۔"

میں نے کانسٹیبل کو پیچھے ہٹا دیا۔ ملزم کراہتا ہوا میز کے نیچے سے باہر آیا اور اُٹھا۔

"جو آپ دلائیں گے لے لوں گا" ___ اُس نے کہا۔

"لے جا اسے" ___ میں نے کانسٹیبل سے کہا ___ "اور اس کو پوری ادائیگی کرا دے۔"

سانڈ جیسا کانسٹیبل اُس کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا میرے دفتر کے پچھلے دروازے سے باہر لے گیا۔ میں آپ کو ایک بات اور بتانا چاہتا

ہوں۔ پیشہ ور مجرم غیر معمولی طور پر ذہین لوگ ہوتے ہیں۔ کسی ماہر نفسیات سے پوچھیں تو وہ آپ کو بھی بتلائے گا۔ لیکن اس لائن میں بعض ایسے بھی آ جاتے تھے جو سمجھتے تھے کہ نقب زنی اور ڈکیتی میں صرف جرأت کی ضرورت ہے۔ وہ جلدی پکڑے جاتے اور اسی قسم کی باتیں کیا کرتے تھے جس طرح یہ شخص کر رہا تھا۔ اس قسم کے احمقوں کی کھوپڑی میں عقل کی بات ڈالنے کے واسطے پولیس کے پاس یہی طریقہ ہوتا تھا جو مَیں نے اختیار کیا تھا۔

پندرہ منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ میرا سانڈ ہنستا ہُوا آیا اور کہنے لگا کہ وہ مان گیا ہے۔

"کیا کہتا ہے؟"

"کہتا ہے کچھ رقم دلا دو جو مَیں اپنی بیوی کو دے دوں" ــــ کانسٹیبل نے کہا ــــ "اور کہتا ہے کہ اُس بے چاری کا پیچھے کوئی نہیں۔ وہ تو یہ بھی کہتا ہے کہ جو لکھو گے اس پر انگوٹھا لگا دوں گا۔"

"لے آؤ" ــــ مَیں نے کہا۔

❀

وہ میرے دفتر میں آیا تو اس طرح جھکا ہُوا اچل رہا تھا جیسے ہسپتال کے کمرے میں ایکسیڈنٹ کا زخمی داخل ہُوا ہو۔ مَیں نے اُس کو اپنے سامنے کرسی پر بٹھایا پھر اُس کو کہا کہ اپنی پگڑی فرش سے اُٹھا کر سر پر رکھ لے۔

"اب بتا تیرا نام کیا ہے؟" ــــ مَیں نے پوچھا۔

"سراج دین ولد اللہ جوایا، موضع کشن گڑھ" ــــ اُس نے اپنا پورا اتہ پتہ بتا دیا۔

"کس نام سے مشہور رہو؟"

"ساجا۔"

"دیکھ ساجے!" ــــ مَیں نے کہا ــــ "مَیں تم کو کچھ رقم دلا دوں گا لیکن تمہاری بیوی تک مَیں اپنے ہاتھ سے پہنچاؤں گا.... تمہاری بیوی کہاں ہے؟" مَیں نے اپنے اندازے کے مطابق کہا ــــ "میرا خیال ہے نکو تمہاری بیوی ہے؟"

"ہاں جناب!"

"لیکن تمہارے ہی پیچھے گھر سے بھاگی تھی!" ــــ میں نے کہا۔

"نہیں جناب!" ــــ اُس نے کہا ــــ "اس کو قسمت کا چکر سمجھیں۔ وہ بھاگی کسی اور کے ساتھ تھی اور ہاتھ میرے چڑھ گئی۔"

یہ واقعہ اُس نے اس طرح سنایا کہ ایک رات وہ رہزنی کے واسطے جو اُس کا پیشہ تھا، راستے میں کھڑا تھا۔ اُس کے ساتھ اُس کا ایک ساتھی بھی تھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں تھیں۔ ایک گھوڑا آیا جس پر دو سوار بیٹھے ہوئے تھے۔ ساجا اور اس کا ساتھی پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئے۔ جونہی گھوڑا قریب آیا یہ دونوں اُٹھے اور گھوڑے کو روک کر انہوں نے کلہاڑیاں تان لیں۔ گھوڑے پر ایک آدمی سوار تھا۔ اُس نے آگے ایک عورت کو بٹھایا ہُوا تھا۔ ساجے نے دونوں کو نیچے اُتار لیا۔

ہلکی ہلکی چاندنی میں نظر آ رہا تھا کہ لڑکی جوان ہے اور بڑی خوبصورت ہے اور آدمی بھی جوان ہے۔

"اگر زندہ آگے جانا ہے تو زیور اور رقم مجھ کو دے دو" ــــ ساجے نے کہا۔

"اور گھوڑا بھی" ــــ ساجے کے ساتھی نے کہا ــــ "لڑکی اپنا زیور اُتار دے اور چلی جائے۔ ہم اس کے جسم کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔"

"وعدہ کرو کہ تم میرے جسم کو ہاتھ نہیں لگاؤ گے" ــــ لڑکی نے کہا ــــ "تمام زیور اُتار کر دے دوں گی۔"

"یہ مردوں کا وعدہ ہے لڑکی!" ــــ ساجے نے کہا ــــ "ہمیں زیور چاہیئے!"

لڑکی نے کانوں سے جھمکے اُتارنے شروع کر دیئے۔ ساجے نے اُدھر توجہ نہ دی کہ لڑکی کے ساتھ جو آدمی تھا وہ گھوڑے کو ساتھ لیے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اُس آدمی نے رکاب میں پاؤں رکھا تب ساجے کے ساتھی نے دیکھا۔ اُس نے اُس آدمی کو گھوڑے پر سوار ہونے سے منع کیا لیکن وہ آدمی گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا۔ جتنی دیر میں ساجے کا ساتھی گھوڑے تک پہنچتا، سوار نے گھوڑا گھمایا اور ایڑ لگا دی۔ وہ لڑکی کو رہزنوں کے سپرد کر کے بھاگ گیا۔ لڑکی نے اُس کو آوازیں دیں لیکن وہ بہت دُور جا چکا تھا۔ ساجے نے لڑکی سے پوچھا کہ یہ آدمی اُس کا کیا لگتا ہے۔

"میں اس کے پیچھے گھر سے بھاگ آئی ہوں" ــــ لڑکی نے کہا ــــ "یہ مجھے ایک گاؤں میں اپنے دوست کے گھر لے جا رہا تھا۔"

"عجب عاشق ہے تمہارا" ــــ ساجے نے کہا ــــ "دل لگانا تھا تو کسی مرد سے لگانا تھا۔"

"گاؤں میں تو کسی کو سر نہیں اٹھانے دیتا" ــــ لڑکی نے کہا ــــ "میں تو کہتی تھی کہ اس جیسا دلیر مرد اس سارے علاقے میں کوئی نہیں ہو گا، لیکن یہ تو اصل فریبی اور بے غیرت نکلا۔"

"لیکن ہم بے غیرت نہیں" ــــ ساجے کے ساتھی نے اس کو کہا ــــ "تم اپنے گاؤں کا نام بتاؤ۔ ہم تم کو وہاں چھوڑ کر آئیں گے۔"

"مجھ پر اتنا رحم کرنا ہے تو ایک کام کرو" ــــ لڑکی نے کہا ــــ "تمہارے پاس کلہاڑیاں ہیں۔ میری گردن کاٹ دو۔ میں اب کس منہ سے اپنے گاؤں کو جاؤں۔ میرے گھر والوں کو پتہ لگ گیا ہو گا کہ میں گھر میں نہیں۔ وہ تو مجھ کو دیکھتے ہی مار ڈالیں گے۔"

مختصر یہ کہ یہ لڑکی جو اپنا نام نگار بی بی اور نگو بتاتی تھی اپنے گاؤں جانے پر رضامند نہیں تھی۔ اس دور کے پیشہ ور مجرموں کی طرح ساجا اور اس کا ساتھی ایک بے بس لڑکی کو بری نیت سے اپنے قبضے میں نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس کو اپنے ساتھ بھی نہیں لے جانا چاہتے تھے لیکن نگو نے ایسی ضد کی کہ وہ اس کو ساتھ لے جانے پر مجبور ہو گئے۔

نگو ساجے کے گھر میں دو دن رہی تو اس نے خود خواہش ظاہر کی کہ اگر ساجا رضامند ہو تو وہ اس کے ساتھ شادی کر لے گی۔ اس طرح ساجے نے نگو کے ساتھ شادی کر لی۔ ساجا گھر میں اکیلا رہتا تھا۔ اس نے مجھ کو اپنی بابت بتایا کہ وہ بہت دور کا رہنے والا ہے لیکن اس کی عادتیں ایسی بگڑی تھیں کہ لڑکپن میں گھر سے بھاگ آیا اور ادھر ادھر دھکے کھا کر استادوں کے ہاتھ چڑھا اور جوانی میں آ کر اس نے رہزنی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ پھر اس نے اس دوست کو اپنے ساتھ ملا لیا۔

"میں نے نقب کبھی نہیں لگائی تھی" ــــ ساجے نے اقبالی بیان دیتے

ہوئے کہا ـــ "لیکن نگو نے مجھ کو مجبور کیا کہ وہ اس شخص سے جس نے اُس کو محبت کا دھوکہ دیا اور جنگل بیابان میں اکیلا چھوڑ کر بھاگ گیا تھا انتقام لینا چاہتی ہے۔ مجھ کو خود بھی اس شخص پر بہت غصہ تھا۔ نگو نے مجھ کو بتایا کہ اس گھر سے صرف ایک ٹرنک اُٹھانا ہے جس میں اس شخص کی بہن کا زیور ہے۔ ریشمی کپڑے ہیں اور نقد رقم بھی اسی ٹرنک میں ہے نگو نے زمین پر انگلی سے لکیریں ڈال کر مجھ کو سمجھایا کہ ٹرنک کون سے کمرے میں ہے اور اُس نے یہ بھی بتایا کہ یہ پیچھے کا کمرہ ہے۔ دیوار توڑ کر اندر جاؤ تو ٹرنک بائیں ہاتھ پڑے ہوئے ہیں۔ اس طرح اُس نے ساری نشاندہی کر دی"

ساجے نے نقب کبھی نہیں لگائی تھی۔ اُس کے ساتھی کو بھی نقب زنی کا تجربہ نہیں تھا لیکن اُس نے ساجے کے ساتھ رہزنی کی وارداتیں کرنے سے پہلے ایک نقب زن ڈکیت کے ساتھ کچھ عرصہ گزارا تھا اور اُس کے ساتھ دو تین وارداتیں کی تھیں۔ اُستاد نے اُس کو نقب زنی کی ٹریننگ دی تھی۔ اُس نے اپنے گھر میں چند فٹ اونچی دیوار بنائی تھی جس پر وہ اپنے شاگردوں کو نقب لگانے کی ٹریننگ دیا کرتا تھا۔ ساجے کے اُس دوست نے جس کا نام جلال تھا، یہ ٹریننگ حاصل کی تھی۔ وہ ساجے کے ساتھ اُس گھر میں یہ واردات کرنے کے لیے تیار ہو گیا اور اینٹیں اکھاڑنے والا اوزار لے آیا۔ یہ لوہے کی ایک موٹی سلاخ ہوتی ہے جس کا سِرا پیچ کس کی طرح چوڑا اور کچھ مڑا ہوا ہوتا ہے۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ اُس زمانے میں دیواروں پر سیمنٹ نہیں بلکہ مٹی کا گارا استعمال ہوتا تھا۔ اس وجہ سے اینٹیں نکالنا کچھ آسان ہوتا تھا لیکن کمال اس میں یہ دکھانا ہوتا ہے کہ آواز نہ پیدا ہو، گھر والوں کو خبر تک نہ ہو۔

ایک رات ساجا اور جلال نقب زنی کے واسطے چلے گئے۔ دن کے وقت جلال اس گاؤں میں آیا تھا اور اُس نے کوئی شک پیدا کیے بغیر واردات والا گھر اور پچھلی دیوار دیکھ لی تھی۔ دونوں نے نقب لگائی۔ یہ ٹرنکوں والا کمرہ تھا۔ اِن کے پاس ٹارچ تھی۔ نگو نے جو نشانیاں بتائی تھیں

وہ دیکھ کر دونوں نے ٹرنک اٹھایا اور نقب میں سے باہر لے آئے۔
اُن کی یہ واردات کامیاب تھی۔ ساجے نے بتایا کہ ٹرنک ابھی تک
اُس کے گھر میں پڑا ہے۔

ساجا نے مجھ کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ پہلی ہی نقب کامیاب ہو
گئی تو نگو بہت خوش ہوئی۔ اُس کو خوشی زیور، رقم اور ریشمی کپڑے دیکھ
کر نہیں ہوئی، خوشی یہ تھی کہ اُس نے انتقام لے لیا تھا۔ اُس جوان آدمی
کا نام سردار محمد تھا جس کے ساتھ نگو گھر سے بھاگی تھی اور جو اُس کو دوسرے ہی روز
کے پاس چھوڑ کر بھاگ آیا تھا۔

زیور بیچنا تھا۔ ساجے کے چوری کے مال کا مستقل خریدار ریسار تھا
لیکن زیور واردات کے فوراً بعد باہر نہیں نکالنا تھا۔ ساجے نے آدھی رقم
اور کچھ کپڑے جلال کو دے دیے اور زیور کی تقسیم فروخت کے بعد ہونی تھی۔
نگو نے ایک روز ساجے کو اپنی گزری ہوئی زندگی کی باتیں بتائیں۔
وہ چونکہ خوبصورت تھی اس وجہ سے گاؤں میں اُس کے چاہنے والے کئی
تھے۔ وہ سب کو ٹالتی رہی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ وہ ماں جیسے چال چلن کی ہوگی
لیکن اُس نے اپنا چال چلن محفوظ رکھا ہوا تھا۔ اُس نے ساجے کو اُس
چوہدری کا نام بتایا جس کے گھر پہلی واردات کے سولہ سترہ روز بعد نقب
لگی تھی۔ اس چوہدری نے ایک روز نگو کو اپنے مکان میں پکڑ لیا اور
دست درازی کی تھی۔

یہ چوہدری نگو کے باپ کی عمر کا تھا۔ نگو اُس کی بیٹی کے پاس گئی تھی
لیکن بیٹی اپنی ماں کے ساتھ کہیں گئی ہوئی تھی۔ گھر میں چوہدری اکیلا تھا۔
اُس نے نگو کو ہوس کے جال میں پھانسنے کی کوشش کی۔ اُس کو کامیابی نہ
ہوئی تو نگو کو اُس نے زبردستی پکڑ لیا۔ نگو جوان لڑکی تھی۔ اُس نے بوڑھے
چوہدری کو ایسا دھکا دیا کہ وہ چارپائی سے نیچے جا پڑا اور نگو بھاگ آئی۔
اب نگو نے اُس چوہدری سے بھی انتقام لینے کا یہی طریقہ سوچا۔
چوہدری کی بیٹی کے بھی زیور اور کپڑے بنے ہوئے تھے۔ نگو نے دیکھا

تھا کہ یہ مال کون سے ٹرنک میں رکھا ہُوا ہے۔ اُس نے ساجے کو اس مکان کا بھی نقشہ اچھی طرح سمجھایا۔ ساجا پہلی واردات کی کامیابی سے شیر ہو گیا تھا۔ اُس نے جلال کو ساتھ لیا اور چوہدری کے مکان کے پچھواڑے اُسی کمرے کو نقب لگائی جس میں ٹرنک رکھا ہُوا تھا۔ وہ دونوں یہ ٹرنک بھی لے آئے۔

بہت دن گزر جانے کے بعد ساجا دونوں وارداتوں کا زیور لے کر شہر گیا۔ نگو کو وہ شہر کی سیر کرانے کے واسطے ساتھ لے گیا تھا۔ نگو نے سردار محمد کی بہن کا جوڑا پہنا تھا۔ سُنار کی دُکان پر گئے تو نگو نے ساجے کو کہنی ماری۔

"نکلو یہاں سے" ـــ اُس نے ساجے کو کہا ـــ "یہ آدمی اور عورتیں میرے گاؤں کی ہیں۔"

ساجے نے تھیلی سُنار کے ہاتھ میں دی اور بڑی تیزی سے باہر نکل آیا۔ اس کے بعد جو ہُوا وہ میں آپ کو سُنا چکا ہوں۔ میں تھانیدار تھا میرا کام اتنا ہی تھا کہ ملزموں کو پکڑ کر سزا دلاؤں۔ اگر میرا قانون چلتا تو اس بڑے چوہدری کو سزا دلاتا جس نے نگو پر دست درازی کی تھی۔ میں سردار محمد کو سزا دلاتا جس نے نگو کو گھر سے نکالا اور اُس کو رہزنوں کے پاس چھوڑ کر بھاگ آیا تھا، مگر میں مجبور تھا۔ قانون چور کو سزا دیتا ہے۔ ایک اچھے بھلے انسان کو چور بنانے والے کے واسطے قانون میں کوئی سزا نہیں۔

ساجا ایک چور تھا جو میرے ہاتھ میں تھا۔ اُس نے اقبالِ جُرم کر لیا۔ وہ بار بار کہتا تھا کہ میں نگو کو رقم بھجوا دوں۔ اُس کے دل میں نگو کی محبت گھر کر گئی تھی۔ اُس کو معلوم نہ تھا کہ نگو کا مستقبل تاریک ہو گیا ہے اور میں اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا اور میرے پاس ایسا کوئی قانون یا ضابطہ نہیں تھا جس کے تحت میں سُنار سے کچھ رقم لے کر نگو کو دے دیتا۔ یہ تو میں ساجے کو پھانسی دے رہا تھا۔ ساجا نگو کی خاطر اقبالِ جُرم کر رہا تھا۔

اس کے بعد نشاندہیاں تھیں جو ساجے نے کر دیں۔ اُس کا ساتھی جلال اپنے گاؤں سے پکڑا گیا۔ ساجا مجھ کو اپنے گاؤں لے گیا تھا۔ وہاں

مَیں نے نگو کو پہلی بار دیکھا۔ بڑی حسین لڑکی تھی لیکن اُس کی قسمت حسین نہیں تھی۔ ساجے کو ہتھکڑیوں میں دیکھ کر نگو کا رنگ لاش کی طرح ہوگیا۔ اُس کی اتنی دلکش آنکھیں سفید ہوگئیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے کھڑے کھڑے اُس کے جسم سے رُوح نکل گئی ہو۔

"میرے بادشاہ!" ساجے نے مجھ کو آہستہ سے کہا ۔۔۔ "اِس عمر میں آکر گھر آباد ہُوا تھا۔ بڑی جلدی اُجڑ گیا.... اِس (نگو) کا کیا بنے گا؟"

"اللہ مالک ہے ساجے!" ۔۔۔ مَیں نے کہا ۔۔۔ "تم پھانسی تو نہیں چڑھ جاؤ گے۔ عمر قید بھی نہیں ملے گی.... تین چار سال!"

اُس کی اور جلال کی خانہ تلاشی میں دونوں کے گھروں سے چوری کے کپڑے اور کچھ چیزیں برآمد ہوئیں۔ ان کی شناخت کے واسطے دونوں گھروں کے آدمی ساتھ تھے۔ دوسری واردات والے گھر کا بڑا چوہدری بھی ساتھ تھا۔

"جناب ان کو عمر قید دلائیں" ۔۔۔ بڑے چوہدری نے مجھ کو کہا ۔۔۔ "اس لڑکی کو آپ نہیں جانتے۔ اپنی ماں سے بڑھ کر بدمعاش ہے۔"

"جہاں تم جیسے بدمعاش موجود ہوں وہاں شریف عورتیں بھی بدمعاش ہو جایا کرتی ہیں" ۔۔۔ مَیں نے اُس کو ذرا پرے لے جا کر کہا ۔۔۔ "یہ تمہاری بیٹی کی عمر کی ہے اور تم نے اس کو اپنے پلنگ پر گرا لیا تھا۔ یہ بدمعاش ہوتی تو تم کو دھکا دے کر فرش پر نہ گرا دیتی.... اپنی بیٹی کے چال چلن سے واقف نہیں ہو؟ اپنے نوکر کو تم نے مار پیٹ کر گھر سے کیوں نکال دیا تھا؟ سزا تو مَیں تم کو دلاؤں گا بدکار انسان! عدالت میں بیان دینے آؤ گے تو دیکھنا ملزموں کا وکیل تمہارے پرخچے کس طرح اُڑاتا ہے۔"

اس شخص کا ضمیر مجرم تھا۔ وہ چپ رہا اور احمقوں کی طرح میرے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ اگر وہ بولتا تو مَیں اُس کو بہت بڑی گالیاں دیتا۔ اس سے بڑھ کر میں اور کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

نگو کو بھی میں تھانے لے آیا۔ اس کا بیان لینا اور یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اس کو ملزم بنانا ہے یا گواہ یا کچھ بھی نہیں۔ جلال نے بھی بیان دے دیا۔ اس نے ساجے کے کہنے پر بیان دیا تھا۔ ستار کو مَیں حوالات میں بند کر گیا تھا۔

"سلجے کو کتنی لمبی قید ملے گی؟" ـــــ نگو نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے اُس سے بیان لینے کے واسطے اُسے دفتر میں بٹھایا تھا۔

"دو تین سال" ـــــ میں نے جواب دیا اور اُس کو خوش کرنے کے واسطے کہا ـــــ "میں کوشش کروں گا کہ اُس کو اس سے بھی کم سزا ملے۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا کہ ساجے کی جگہ آپ مجھ کو قید دے دیں؟" ـــــ نگو نے پوچھا۔

"نہیں نگو!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "تم بیان دو پھر دیکھوں گا کہ تم لوگوں کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

اس طرح کچھ باتیں کہہ سُن کر نگو نے بیان دیا جو دراصل اُس کی زندگی کی کہانی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ مجھ کو سُنا رہی تھی۔ وہ تین بہنیں تھیں۔ نگو سب سے بڑی تھی۔ اُس کی چھوٹی بہن سترہ سال کی ہو گئی تھی۔ نگو نے صاف لفظوں میں کہا کہ اُس کی ماں بدکار اور عیار عورت تھی۔ اُس عورت کی بابت مجھ کو تفتیش کے دوران دوسروں سے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ خوبصورت تھی اور دوسروں سے روپیہ کھینچنا اُس کی فطرت میں شامل ہو گیا تھا۔ اُس کی اپنی عمر ڈھل گئی تو اُس کی بیٹی نگو جوان ہو گئی۔ اُس نے نگو کے ذریعے ریشمی کپڑے اور پیسے کھینچنے شروع کر دیے۔

یہ نہ سمجھیں کہ اُس نے نگو کو عصمت فروش بنا دیا تھا۔ وہ تو سخت نگرانی کرتی تھی کہ نگو کسی کے ساتھ خراب نہ ہو جائے۔ وہ کسی کے ساتھ نگو کے رشتے کا وعدہ کرتی تھی۔ اُس کا جواب ہاں بھی نہیں ہوتا تھا اور نہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ نگو کی خوبصورتی اور جسم کی کشش سے فائدہ اُٹھاتی تھی۔ ایک اُمیدوار کی کھال اُتار کر کسی اور کو پھانس لیتی تھی۔

نگو کو اُس نے بچپن سے ہی ٹریننگ دینی شروع کر دی تھی کہ مردوں کو کس طرح انگلیوں پر نچا کر اُن سے تحفے اور نقدی کھینچی جاتی ہے۔ اس ٹریننگ نے نگو کو ہوشیار اور چالاک بنا دیا تھا۔ وہ اتنی ہنس مکھ اور زندہ دل ہو گئی تھی کہ گاؤں کی لڑکیاں اُس کو اپنی سہیلی سمجھتی تھیں۔ امیر زمینداروں

کی حویلیوں اور چوباروں میں اُس کو محبت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اِن چوباروں کے جوان آدمی نگو کو کسی اور نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ بدکارہ ماں کی بیٹی بھی بدکارہ ہی ہو گی لیکن نگو کا اخلاق اتنا ڈھیلا نہیں تھا۔

اُس نے مجھ کو بتایا کہ وہ جب نوجوانی کی عمر میں پہنچی تو اُس کو اپنی ماں کی فطرت بُری لگنے لگی۔ اُس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اُس کی ماں نے ابھی تک کس کس کے ساتھ قابلِ اعتراض تعلقات رکھے ہوئے ہیں۔ اُس نے ماں کی تربیت کو اپنی فطرت سے نکالنا شروع کر دیا۔ نگو کے رشتے کے وعدوں پر اُس کی ماں نے بہت پیسہ کما لیا تھا لیکن نگو نے سردار محمد کے ساتھ دل لگا لیا۔

اُس کی ماں نے سردار محمد سے بھی کھانے کی کوشش کی لیکن نگو نے اُس کا راستہ روک لیا۔ اُس نے سردار محمد کو کہا کہ وہ اُس کی ماں کو ایک پیسہ نہ دے۔ سردار محمد امیر زمینداروں کا بڑا خوبصورت اور جوان بیٹا تھا۔ وہ بھی نگو کو چاہتا تھا لیکن نگو نے مجھ کو بتایا کہ سردار محمد اُس کو غلط طرف لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ نگو تھی جس نے محبت کو پاک رکھا۔

سردار محمد نے نگو کی ماں کی فرمائشیں پوری کرنی چھوڑ دیں۔ اُس عورت نے اُس کو رشتے سے جواب دے دیا۔ سردار محمد اور نگو نے گھر سے بھاگنے کا فیصلہ کر لیا اور ایک رات وہ گاؤں سے بھاگ نکلے۔

"وہ تم کو کہاں لے جا رہا تھا؟" ــــ مَیں نے نگو سے پوچھا۔

"کہتا تھا کہ ایک گاؤں میں ایک دوست کے گھر چلیں گے" ــــ نگو نے جواب دیا۔

راستے میں جس طرح اُن کو ساجا اور جلال ملے اور جس طرح سردار محمد وہاں سے بھاگا، وہ آپ کو ساجے کی زبانی سُنا چکا ہوں۔ نگو نے اپنے گھر جانے کی بجائے ساجے کو ہی قبول کر لیا۔

"مَیں نے دل پہ پتھر رکھ کر ساجے کے ساتھ شادی کی تھی" ــــ نگو نے بیان دیتے ہوئے کہا ــــ "ساجا رہزن تھا۔ مَیں تو سمجھتی تھی کہ یہ مجھ کو بہت پریشان کرے گا لیکن اُس سے مجھ کو جو پیار ملا وہ سردار محمد سے

نہیں ملا تھا.... مجھ کو سردار محمد اور بڑے چوہدری پر اتنا غصہ آیا کہ میں ان سے انتقام لینے کی سوچنے لگی۔"

نگو نے جس طرح انتقام لیا وہ آپ سن چکے ہیں مگر یہ انتقام اُس کو بہت مہنگا پڑا۔ ساجے اور جلال کو نقب زنی کی دو وارداتوں میں چار چار سال سزائے قید ملی، یعنی دونوں کی سزا آٹھ آٹھ سال تھی۔ دونوں سزائیں اکٹھی شروع ہونی تھی۔ اس طرح انہیں چار چار سال جیل میں رہنا تھا۔ ہندو سُنار کو دو دفعات کے تحت سزا ہوئی۔ چوری کا مال جانتے ہوئے کہ چوری کا مال ہے، خریدنے کے جُرم میں دو سال اور ایک پیشہ ور رہزن کے جرائم پر پردہ ڈالنے کے جُرم میں ایک سال قید ملی۔

میں نے نگو کو نہ ملزم کے طور پر پیش کیا تھا نہ گواہ کے طور پر۔ اس کے بعد نگو پر کیا بیتی؟ یہ ایک اور کہانی ہے۔

کتاب کا کور

عامر بلال

رابطہ

فیس بک

https://www.facebook.com/aamiralibilal

ٹویٹر

http://twitter.com/aamirbilal

انسٹاگرام

https://www.instagram.com/aamirbilal

یوٹیوب

https://www.youtube.com/@aamirbilal

عشق ایک چڑیل کا

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان کئی ایک علوم کے بانی ہیں۔ ان میں طب اور سائنس بھی شامل ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں کئی ایک مسلمانوں نے ان علوم میں نام پیدا کیا ہے لیکن آگے چل کر مسلمان ترقی کرنے کی بجائے پسماندگی میں گرنے شروع ہو گئے۔ میری ذاتی رائے اور میرا مشاہدہ یہ ہے کہ مسلمان بے شک پسماندگی اور عیاشی کی طرف چلے گئے لیکن اُن کا دماغ ہمیشہ نئی سے نئی دریافت میں لگا رہا۔ میں نے اپنی سروس میں ہزاروں مجرموں کو پکڑا ہے اور ان کی وارداتوں کی تفتیش کی ہے، لیکن پولیس اور قانون کو دھوکا دینے کے واسطے جو طریقے مسلمانوں نے آزمائے ہیں، ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان پیدائشی مُوجد ہے۔ کہتے ہیں کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، میں کہتا ہوں مسلمان ایجاد کا باپ ہے۔

آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ اس سے آپ کو یہ بھی اندازہ ہو گا کہ ہم مسلمان پسماندگی کی کتنی گہری پستی میں گرے ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے دماغ کتنے تیز ہیں۔

یہ واقعہ پاکستان بننے سے کچھ سال پہلے کا ہے اور واردات کا علاقہ ایک پاکستانی صوبے کا ہے اس وجہ سے میں کسی جگہ کا اور کسی فرد کا صحیح نام نہیں لکھوں گا۔ وہ دیہاتی علاقے کا تھانہ تھا۔ تھانہ خاصے بڑے گاؤں میں تھا۔ جو اب اتنا بڑا قصبہ بن گیا ہے کہ اُس زمانے کے شہر کے برابر ہو گیا ہے۔ مجھ کو اس تھانے میں تعینات کیا گیا۔ وہاں ایک پٹھان سب انسپکٹر تھا جس سے میں نے چارج لینا تھا۔ مجھ کو بتایا گیا تھا کہ اس پٹھان سب انسپکٹر زرگل خان کا بچہ جس کی عمر دس گیارہ سال تھی، اغوا ہو گیا ہے اور وہ ابھی اُسی تھانے میں رہے گا۔

مجھ کو یہ پتہ نہیں تھا کہ اُس کا بچہ کس طرح اغوا ہُوا ہے۔ میں سمجھا کہ پٹھانوں کی آپس میں خاندانی عداوت ہوتی ہے۔ زرگل کا کوئی دشمن آیا اور اس کے بچے کو اغوا کر کے علاقہ غیر میں لے گیا ہو گا۔ دوسری وجہ میرے دماغ میں یہ آئی کہ اُس نے کسی پیشہ ور ڈاکو کو پکڑا ہو گا اور اس ڈاکو کے آدمیوں نے انتقام لینے کے واسطے زرگل کا بچہ اغوا کر لیا ہو گا۔ اُس زمانے میں خرکار کیمپ نہیں ہوتے تھے اور بچوں کو اپاہج کر کے اُن کو گداگر بنانے کا ظلم بھی نہیں تھا۔

میں اس تھانے میں چارج لینے گیا تو زرگل کو بہت بُری ذہنی حالت میں دیکھا۔ میں نے سب سے پہلے اُس کے بچے کے اغوا کی بابت پوچھا۔

"سب کہتے ہیں کہ بچے کو چڑیلیں اُٹھا کر لے گئی ہیں" ـــــ زرگل نے کہا ـــــ "میں نہیں مانتا۔ میری اتنی عمر ہو گئی ہے۔ میں جنگلوں میں اور ویران علاقوں میں راتوں کو جاتا رہا ہوں۔ مجھ کو کبھی چڑیل نظر نہیں آئی"۔

اُس کی کسی کے ساتھ دشمنی بھی نہیں تھی۔ میں اُس کی اس بات پر بہت حیران ہُوا کہ بچے کو چڑیل اٹھا کر لے گئی ہے۔ اُس نے اپنے بچے کی تلاش کے واسطے یہ انتظام کیا تھا کہ مجھ کو چارج دے کر اُس نے ایک مہینہ نہیں رہنا تھا۔ اُس نے ایک مہینے کی چھٹی منظور کرا لی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اُس کے بچے کی گمشدگی کی تفتیش اور سراغرسانی میں نے کرنی تھی اور اُس نے میرے ساتھ رہنا تھا۔ میں نے چارج لینا شروع کر دیا۔ اس چارج میں مختلف وارداتوں کی تفتیش بھی شامل تھی۔ ان میں ایک واردات بہت ہی خوفناک اور پُراسرار تھی۔ میں آپ کو یہی واردات سناؤں گا۔

کچھ دن پہلے زرگل اپنے تھانے میں بیٹھا ہُوا تھا۔ ابھی اُس کا بچہ اغوا نہیں ہُوا تھا۔ اُس کو تبادلے کا آرڈر مل چکا تھا جس میں لکھا تھا کہ انسپکٹر محبوب عالم تھانے کا چارج لینے کے واسطے آ رہا ہے۔ تھانے کا ایک کانسٹیبل کسی گاؤں میں سمن کی تعمیل کے واسطے گیا ہُوا تھا۔ وہ واپس آیا تو اتنا خوفزدہ تھا کہ اُس کے منہ سے بات بھی نہیں نکلتی تھی۔ وہ مسلمان تھا۔ بات کرتے کرتے کلمہ شریف پڑھنے لگتا تھا۔ اُس کے ہاتھ

کانپ رہے تھے۔ زرگل نے اُس کو گالی دی اور بزدلی کا طعنہ بھی دیا اور کہا کہ وہ جوان مردوں کی طرح حوصلہ کر کے بات سُنائے۔

کانسٹیبل نے ایک گاؤں کا نام لیا اور اُس نے سنایا کہ وہ واپسی پر اس گاؤں کے قریب سے گزرا تو اُسے عورتوں کے رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ گاؤں میں یہ دیکھنے کے واسطے چلا گیا کہ کون مر گیا ہے۔ نمبردار نے اُس کو دیکھا تو اُس کے پاس آگیا۔ کانسٹیبل نے نمبردار سے پوچھا کہ کون فوت ہو گیا ہے۔ نمبردار نے اُس کو ایک آدمی کا نام لے کر بتایا کہ وہ مر گیا ہے۔ اس شخص کا نام منظور سمجھ لیں۔

"اگر تمہارا دل مضبوط ہے تو اُس کی میّت دیکھو" ــــ نمبردار نے کانسٹیبل کو کہا ــــ "میرے ساتھ آؤ اور تم ضرور دیکھو"

کانسٹیبل اُس کے ساتھ چلا گیا۔ نمبردار اُس کو ماتم والے گھر لے گیا۔ میّت کو غسل دے کر کفنایا جا چکا تھا۔ نمبردار نے کانسٹیبل کو قریب لے جا کر کفن ایک طرف کیا اور میّت کا منہ ننگا کیا۔

"خان صاحب!" ــــ کانسٹیبل نے ہکلاتے ہوئے سب انسپکٹر زرگل خان کو بتایا ــــ "اگر میں اکیلا ہوتا تو بے ہوش ہو کر گر پڑتا۔ میّت کا کلیجہ اُس کے منہ سے باہر آیا ہوا تھا۔ اُس کو اسی حالت میں غسل دیا گیا تھا۔ میں فوراً باہر نکل آیا اور نمبردار میرے پیچھے پیچھے آگیا۔ اُس نے مجھ کو بتایا کہ منظور رات کو باہر کھلیان کی رکھوالی کے واسطے کھلیان ہی میں سویا ہوا تھا۔ وہ تین چار راتوں سے وہیں سوتا تھا۔ آج صبح لوگوں نے جا کر دیکھا۔ وہ پیٹھ کے بل چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ اور اس کا کلیجہ منہ سے باہر آیا ہوا تھا۔ سب کہتے ہیں کہ اس کو چڑیل مار گئی ہے۔"

نمبردار نے کانسٹیبل کو بتایا کہ گاؤں کے تمام لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ سب یہی کہتے تھے کہ کسی چڑیل نے اس کا کلیجہ منہ کے راستے باہر نکال کر مار دیا ہے۔ ایک شاہ جی کو بلایا گیا۔ اُس نے لاش دیکھ کر فوراً کہا کہ یہ اُسی پاگل چڑیل کا کام ہے جو کبھی کبھی عورت کے روپ میں آ جاتی ہے اور کسی خوبصورت جوان کو دیکھتی ہے تو اُس کو تنگ کرتی ہے۔

زرگل نے اس کانسٹیبل کی بات نہ سُنی۔ صرف یہ پوچھا کہ میت کا جنازہ نکلنے میں کتنی دیر تھی۔ کانسٹیبل نے اُس کو بتایا کہ اُس نے یہ بات تو کسی سے نہیں پوچھی۔ ایسا پتہ لگتا تھا کہ جنازہ جلدی کر دیں گے میت کو غسل دے کر کفنا دیا گیا تھا۔"

زرگل فوراً اُٹھا اور اُس نے کہا کہ میری گھوڑی فوراً لے آؤ۔ ذرا سے وقت میں اُس کی گھوڑی آگئی۔ اُس نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو کہا کہ وہ سائیکلوں پر دو کانسٹیبل لے کر میرے پیچھے آئے۔ زرگل گھوڑی دوڑاتا ہوا ماتم والے گاؤں جا پہنچا۔ وہ گاؤں کم از کم اڑھائی میل دُور تھا۔ اُس نے دُور ہی سے قبرستان میں لوگوں کو دیکھ لیا تھا۔ وہ قبرستان میں گیا لوگ جنازہ پڑھ چکے تھے اور میت کو قبر کے قریب لے گئے تھے میت کو قبر میں اُتارنے لگے تو زرگل قبر کے اوپر جا پہنچا اور کہنے لگا ٹھہر جاؤ۔ وہ گھوڑی سے اُتر کر میت کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"منہ ننگا کرو" —— زرگل نے کہا۔

لاش کا منہ ننگا کیا گیا۔ اس نے دیکھا کہ میت کے مُنہ سے جگر کا کم از کم چار، پانچ لمبا ٹکڑا باہر آیا ہوا ہے۔

"یہ ایک پاگل چڑیل کا کام ہے جناب!" —— زرگل کو کسی کی آواز سنائی دی۔

اُس نے دیکھا یہ وہی شاہ جی تھا جس نے کھلیان میں لاش کو دیکھ کر یہی بات کہی تھی۔

"سولہ آنے سچ ہے شاہ جی!" —— نمبردار نے کہا —— "کوئی انسان کسی انسان کا کلیجہ اس طرح منہ کے راستے نہیں نکال سکتا۔"

"چارپائی اٹھواؤ" —— زرگل نے نمبردار کو حکم دیا —— "اور تھانے پہنچاؤ ..... اور چلو تم بھی تھانے پہنچو۔"

لوگوں میں کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ وہ تھانیدار کے اس حکم کو ٹھیک نہیں سمجھتے تھے لیکن تھانیدار کے آگے بولنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ شاہ جی اس علاقے کا پیر تھا۔ اُس نے آگے ہو کر کہا کہ خان صاحب میت

کی بے حرمتی نہ کریں۔

"شاہ جی!" ـــــ زر گل نے کہا ـــــ "میت کا پوسٹ مارٹم ہو گا۔"

"آپ اس وقت تھانیداری کے رعب میں ہیں" ـــــ شاہ جی نے کہا ـــــ "میں ڈرتا ہوں کہ آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ یہ سوچ لیں کہ اس کو چڑیل نے ہلاک کیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ چڑیل آپ کے پیچھے پڑ جائے۔"

"چارپائی اٹھاؤ اور چلو" ـــــ زر گل نے بڑے سخت رعب سے کہا اور اُس نے ہیڈ کانسٹیبل کو کہا ـــــ "تم ساتھ جاؤ..... فوراً۔"

چار آدمیوں نے چارپائی اُٹھائی اور چل پڑے۔ زر گل گھوڑی پر سوار ہُوا اور کوئی مزید بات کیے بغیر وہاں سے آ گیا۔ نو دس میل دُور ایک قصبہ تھا۔ وہاں سول ہسپتال تھا۔ پوسٹ مارٹم وہاں ہونا تھا۔

سب انسپکٹر زر گل کی اس کارروائی سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اُس نے نہیں مانا تھا کہ منظور کو چڑیل نے مارا ہے اور مارنے کا طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ اُس کا کلیجہ منہ کے راستے باہر نکال دیا ہے۔ زر گل پکا پٹھان تھا۔ ہٹ کا بڑا سخت تھا۔ رعب دار آدمی تھا۔ بڑے اونچے درجے کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ روپے پیسے کا بھوکا نہیں تھا۔ اُس کا پیٹ بھرا ہُوا تھا۔ سو فیصد دیانتدار آدمی تھا۔ اُس میں صرف یہ نقص تھا کہ تفتیش کی گہرائی میں جانے کی قابلیت نہیں رکھتا تھا حالانکہ اُس کے دماغ میں عقل اور ذہانت موجود تھی۔ وہ بیگناہ کو مشتبہ بٹھا لیتا تھا جب تک یقین نہ ہو جاتا کہ یہ شخص ملزم ہے، اُس کو ایذا رسانی کی چکی میں ڈال دیتا تھا۔ شہادت خود نہیں ڈھونڈتا تھا۔ اس کی بجائے ملزم کی ہڈیاں گرم کر کے اُس کی زبان سے شہادت اُگلوا لیتا تھا۔

اُس کو خبر ملی کہ ایک آدمی کو کوئی چڑیل مار گئی ہے اور اُس کا کلیجہ منہ سے نکلا ہُوا ہے تو اُس نے کہہ دیا کہ یہ جھوٹ ہے اور اُس نے فوراً جا کر لاش کو برائے پوسٹ مارٹم اپنے قبضے میں لے لیا مگر اس کے آگے اُس کے واسطے مشکل بن گئی تھی کہ اپنے شک کو صحیح کس طرح

ثابت کرے۔

میں آپ کو کلیجہ منہ کے راستے نکلنے کا معاملہ سُنا دوں تو ٹھیک

رہے گا۔ جنوں اور چڑیلوں کی موجودگی کو آج کے سائنسی اور ترقی یافتہ دور میں بھی لوگ مانتے ہیں۔ میں جنوں کی بابت کوئی بات نہیں کروں گا۔ چڑیلوں کو میں نہیں مانتا۔ کہتے ہیں کہ دیہات کے لوگ پسماندہ ہونے کی وجہ سے چڑیلوں کو مانتے ہیں کہ ویران علاقوں میں رہتی ہیں لیکن دیہات میں ہی نہیں شہروں میں بھی لوگ چڑیلوں کو مانتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ دیہاتی لوگ زیادہ مانتے ہیں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے چڑیلوں کی کہانیاں سُن رہا ہوں۔

ایسے واقعات تو بہت سنے تھے کہ رات کو ایک آدمی کہیں جا رہا تھا۔ یہ دیہات کے علاقے کی کہانیاں ہیں۔ لوگ پیدل چلا کرتے تھے۔ اس آدمی کو راستے میں ایک بڑی خوبصورت عورت کھڑی نظر آئی۔ عورت نے اُس سے پوچھا کہاں جا رہے ہو۔ اس آدمی نے بتایا تو وہ عورت اُس کو کہنے لگی کہ وہ اکیلی ہونے کی وجہ سے اُس کے ساتھ جانا چاہتی ہے۔ وہ آدمی اُس کو اپنے ہمراہ لے گیا۔ عورت دو تین قدم پیچھے رہ گئی۔ آدمی نے پیچھے دیکھا عورت کی بجائے ایک بکری اُس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ وہ آدمی ڈر گیا اور کلمہ شریف پڑھتا ہوا وہاں سے دوڑ پڑا۔ اُسے پیچھے سے آواز آئی کہ خوش قسمت ہو نکل گئے ہو۔ وہ چڑیل تھی۔

ایسے واقعات آج بھی سُننے میں آتے ہیں۔ دیہاتی علاقوں میں ذرا زیادہ ہوتے ہیں لیکن شہروں میں بھی ان واقعات کو سچ مانا جاتا ہے۔ یہ مشہور ہے اور اس کو لوگ بالکل صحیح مانتے ہیں کہ چڑیلوں کے ہاتھ اور پاؤں اُلٹے ہوتے ہیں اور آنکھیں ذرا ٹیڑھی ہوتی ہیں۔ اگر آپ کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی کوئی چیز مثلاً چھری، چاقو، کلہاڑی، تلوار وغیرہ ہو تو چڑیل آپ کے قریب نہیں آئے گی۔ یہ بھی مشہور ہے کہ آپ کا کسی چڑیل کے ساتھ آمنا سامنا ہو جائے تو کسی طرح دائیں بائیں پینترا بدل کر اُس کے سر کے بال پکڑ لیں۔ کہتے ہیں کہ اُس کے بال پکڑ لو تو وہ چیختی چلاتی اور منتیں کرتی

ہے کہ اُس کو چھوڑ دیا جائے۔

چڑیلوں کی یہ بات بھی مشہور ہے کہ وہ کسی آدمی سے کوئی مطالبہ کرتی ہے تو یہ ضرور کہتی ہے کہ تم نے یہ کام نہ کیا تو تمہارا کلیجہ منہ کے راستے باہر نکال دوں گی۔ میں نے بچپن سے اب تک کم از کم دو سو ایسے واقعات سنے ہیں کہ چڑیل نے ایک آدمی کا کلیجہ منہ کے راستے نکال دیا اور وہ آدمی مر گیا۔

یہ بھی لوگ سچ مانتے ہیں کہ چڑیل ایک آدمی پر عاشق ہو گئی اور اُس کو وہ نہایت خوبصورت عورت کے روپ میں ملتی تھی۔ ایک واقعہ یہ بھی سُنا تھا کہ ایک آدمی نے ایک اجنبی عورت کے ساتھ شادی کر لی۔ بیس سال بعد وہ آدمی مر گیا اور اُس کی بیوی اُس کی میت کے پاس کھڑے کھڑے غائب ہو گئی۔ تب لوگوں کو پتہ چلا کہ یہ تو چڑیل تھی جو عورت کے روپ میں بیس سال اس آدمی کے ساتھ گزار گئی اور یہی وجہ تھی کہ اُس نے ایک بھی بچہ نہ جنا۔ "ماہرینِ چڑیلیات" کہتے ہیں کہ چڑیل انسان کا بچہ پیدا نہیں کر سکتی۔

دیہات میں تو اب بھی مرد اور چڑیل کے معاشقے کی کہانیاں سُنی سنائی جاتی ہیں اور کلیجہ منہ کے راستے نکالنے کے واقعات بھی لوگ سُناتے ہیں۔ اس زمانے میں جب میں سرکس میں تھا اور دیہاتی علاقوں کے تھانوں میں تھا، چڑیلوں کے بہت سارے قصے سُنا کرتا تھا۔ آپ اس بات پر غور کریں کہ مجھ کو جو کوئی ایسی کہانی سُناتا تھا اُس کو میں کہا کرتا تھا کہ اُس نے اپنی آنکھوں سے تو یہ واقعہ نہیں دیکھا پھر اُس کو کس طرح معلوم ہے کہ یہ واقعہ بالکل سچ ہے۔ اُس کا مجھ کو یہ جواب ملتا تھا کہ جس آدمی نے یہ واقعہ سُنایا ہے اُس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، یا یہ جواب ملتا تھا کہ میرے چچا نے یا ماموں نے خود دیکھا ہے۔

مجھ کو آج تک ایسا کوئی آدمی نہیں ملا جس نے اپنی آنکھوں ایسا واقعہ دیکھا ہو یا کسی آدمی کا کلیجہ منہ سے باہر آیا ہُوا دیکھا ہو، لیکن لوگ ان واقعات کے خلاف کچھ سُننا بھی نہیں چاہتے۔ ایک اور واقعہ یاد آتا ہے۔ سننے

والا ایک اے۔ ایس۔ آئی تھا۔ ایک بڑا خوبصورت جوان آدمی کھلیان کی رکھوالی کے واسطے کھیتوں میں سویا ہوا تھا۔ ایک چڑیل آگئی۔ اُس نے عورت کا روپ دھارا ہوا تھا۔ اس آدمی کو جگا کر اُس نے کہا کہ میرا دودھ پیو۔

اُس آدمی نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں اُلٹے ہیں اور یہ چڑیل ہے تو اُس نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی۔ چڑیل نے اُس کو پکڑ لیا۔ اس آدمی نے چڑیل کا مطالبہ پورا نہ کیا۔ آخر چڑیل نے اُس کا کلیجہ منہ کے راستے باہر نکال دیا اور وہ مرگیا۔

میں نے اس اے ایس آئی کو کہا کہ اُلو کے پٹھے، وہ آدمی مرگیا تھا تو تم لوگوں کو کس طرح خبر ہوئی کہ چڑیل آئی تھی اور اُس کے ساتھ اُس آدمی کی کیا بات ہوئی تھی۔ اے ایس آئی نے کہا کہ چڑیل نے دوسرے کھلیان میں ایک آدمی کو جگایا اور اُس کو بتایا تھا۔ میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے پوچھا کہ اُس دوسرے آدمی سے اُس نے خود یہ واقعہ سُنا تھا؟ اے ایس آئی نے جواب دیا کہ اُس نے کسی اور سے سُنا تھا۔

انسپکٹر زرگل خان نے مجھ کو بتایا کہ لڑکپن سے وہ چڑیلوں کی اسی طرح کی کہانیاں سنتا آیا تھا جن پر اُس نے کبھی بھی یقین نہیں کیا تھا۔ دو تین مرتبہ لڑکوں کے ساتھ اُس نے شرط لگائی تھی کہ وہ ساری رات اُس جگہ گزارے گا جہاں لوگ کہتے ہیں کہ چڑیلیں ہوتی ہیں۔ فرنٹیئر کے علاقے میں ایسی ویران جگہیں موجود ہیں جہاں دن کو بھی ڈر لگتا ہے۔ پہاڑیوں پر گھاس کی پتی بھی نہیں اُگتی۔ بعض چٹانیں نوکدار سلوں یا پتھروں کی ہوتی ہیں۔ رات کو وہاں سے گزرو تو اس طرح پتہ لگتا ہے جیسے عورتیں بین کر رہی ہیں اور رو رہی ہیں۔ یہ دو چٹانوں کے درمیان سے جو ہوا گزرتی ہے وہ سلوں اور پتھروں سے ٹکرا کر رونے اور چیخنے جیسی آوازیں پیدا کرتی ہے۔

زرگل نے مجھ کو ایسے ہی واقعات سنائے جو میں نے آپ کو سنائے ہیں۔ وہاں بھی لوگ چڑیلوں کی ان وارداتوں کو صحیح مانتے تھے اور اب بھی مانتے ہیں لیکن زرگل جو صرف آٹھ جماعتیں پڑھا ہوا تھا ان واقعات کو صحیح نہیں

مانتا تھا۔ اُس نے اُن جگہوں پر جا کر اور وہاں بہت سارا وقت گزار کر دوستوں کو دکھا دیا کر دیکھو مجھ کو کوئی چڑیل نہیں ملی۔ پھر بھی لوگ اُس کو غلط کہتے تھے اور اُس کے ماں باپ اُس کو منع کرتے تھے کہ وہ کسی روز کسی چڑیل کے ہاتھوں مارا جائے گا، لیکن زرگل بہت دلیر اور اپنی بات پر ڈھیٹ بن کر اَڑ جانے والا آدمی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جونہی اُس کو خبر ملی کہ ایک آدمی کا کلیجہ منہ کے رستے کسی چڑیل نے نکال کر اُس کو مار دیا ہے تو وہ گولی کی طرح اُس کے گاؤں پہنچ گیا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ دیر سے آئی تھی کیونکہ سول ہسپتال قصبے میں تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ موقعہ واردات پر یعنی اُس جگہ جہاں منظور حسین مرا ہُوا پایا گیا تھا، برائے معائنہ گیا تھا؟ وہاں کھُروں کی موجودگی لازمی تھی۔ زرگل نے مجھ کو بتایا کہ وہ اِس وجہ سے وہاں نہیں گیا تھا کہ اُس کو پتہ لگ گیا تھا کہ سارے گاؤں کی آبادی وہاں اکٹھی ہو گئی تھی۔ اِس حالت میں ملزموں کے کھُرے ملنا ناممکن تھا۔ اُس نے نمبردار کو اور کچھ اور آدمیوں کو تھانے میں بلا لیا تھا۔

پوسٹمارٹم رپورٹ رات کے دس بجے سے کچھ بعد موصول ہوئی اس میں لکھا تھا کہ مرنے والا گلا گھونٹنے سے ہلاک ہُوا ہے اور اُس کے منہ میں کلیجی کا ایک ٹکڑا تھا جس کا ڈاکٹر نے وزن بھی لکھا تھا۔ مجھ کو اچھی طرح یاد نہیں کہ وزن کتنا تھا۔ یہ یاد ہے کہ زرگل نے مجھ کو وزن ایک پاؤ سے کچھ کم بتایا تھا۔ ڈاکٹر نے یہ بھی لکھا تھا کہ یہ کلیجی کسی انسان کی نہیں، کسی جانور کی ہے۔ یہ تصدیق کرانے کے لیے کہ یہ کلیجی مقتول کی نہیں یا کسی انسان کی نہیں۔ کلیجی کا پارسل بنا کر لاہور برائے معائنہ ماہرین بھیج دی گئی۔

زرگل نے ڈاکٹر سے جو بات معلوم کرنی تھی وہ بھی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں موجود تھی۔ وہ یہ تھی کہ مقتول کی اپنی کلیجی جسے صحیح الفاظ میں جگر کہتے ہیں اُس کے جسم میں موجود تھی اور بالکل صحیح اور سلامت تھی۔

ڈاکٹر نے یہ بھی لکھا تھا کہ موت سانس رُک جانے سے واقع ہوئی ہے اور ہاتھوں سے گلا گھونٹنے کے نشان گردن پر صاف طور پر موجود ہیں۔

لاش وارثوں کے حوالے کر کے زرگل نے مقتول کے باپ کو بلایا لیکن پتہ لگا کہ اُس کا باپ بہت عرصے کا مر چکا ہے۔ ضرورت اُس کے کسی خون کے رشتہ دار کی تھی جو مقتول کے گھریلو اور ذاتی معاملات صحیح طور پر بتا سکتا۔ صبح تک تھانے میں رونق لگی ہوئی تھی۔ مقتول کی ماں کی طرف سے ایف آئی آر زیرِ دفعہ ۳۰۲ تحریر ہوئی جو زرگل نے مجھ کو دکھائی۔ میں نے نوٹ کیا کہ ایف۔آئی۔آر کچھ کمزور لکھی ہوئی تھی۔ میں آپ کو تعزیرات کی ایک خاص بات بتاتا ہوں۔ نالائق تھانیدار کی تحریر کی ہوئی کمزور ایف آئی آر اور چالاک ملزم کا اقبالی بیان خواہ وہ زیرِ دفعہ ۱۶۴ ہو، عدالت میں جا کر یہ دونوں چیزیں مقدمے کو چوپٹ کر دیتی ہے۔

میں آپ کو قانونِ شہادت اور ضابطہ فوجداری کی باریکیوں میں نہیں لے جانا چاہتا۔ آپ کو بہت پریشانی ہوگی۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ زرگل نے بڑی صحیح کارروائی کی تھی کہ شک کی بنا پر کسی کی رپورٹ کے بغیر قتل کا مقدمہ درج کر لیا تھا۔ اسی کو کہتے ہیں آ بیل مجھے مار لیکن اُس دور میں تھانیدار اپنے آپ کو لوگوں کے جان و مال اور قانون کا محافظ سمجھتے تھے اور دیانتداری سے اپنی ڈیوٹی پوری کرتے تھے۔ اب زرگل اس واردات کی تفتیش کا چارج مجھ کو دے رہا تھا۔ اُس نے تفتیش کو جس حد تک پہنچایا تھا وہ میں آپ کو سنا دیتا ہوں۔

زرگل نے سب سے پہلے مقتول کے بزرگوں مثلاً چچا، تایا، ماموں وغیرہ سے معلوم کیا تھا کہ اُن کی یا منظور کی خاندانی یا ذاتی دشمنی کسی کے ساتھ تھی؟ سب نے کہا تھا کہ اتنی سخت دشمنی نہ خاندان کی کسی کے ساتھ تھی نہ مقتول کی۔ مقتول کی ماں کا بیان بھی ایسا ہی تھا۔ ماں تو مانتی ہی نہ تھی کہ اُس کے بیٹے کو کسی انسان نے قتل کیا ہے۔ وہ کہتی تھی کہ اُس کا بیٹا اتنا خوبصورت جوان تھا کہ کوئی چڑیل اُس پر عاشق ہو گئی تھی اور کسی دوسری چڑیل نے اُس کو مار ڈالا۔ زرگل نے اُس کو اچھی طرح سمجھایا کہ اُس کے بیٹے کے منہ میں بھیڑ یا بکری کی کلیجی کا ٹکڑا دیا گیا تھا، لیکن یہ عورت نہیں مانتی تھی۔ زرگل کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ماں نے بتایا کہ اپنی بیوی کے

ساتھ مقتول کی زندگی بہت اچھی اور پیار محبت سے گزر رہی تھی۔

مقتول کے چال چلن کی بابت معلومات ضروری تھیں۔ اُس کی ماں نے تو یہی کہنا تھا کہ اُس کا بیٹا پکا مومن تھا۔ یہ باتیں زرگل نے دوسروں سے معلوم کیں۔ اُس نے نمبردار کا بیان لیا۔

"جناب آپ مالک اور حاکم ہیں" ــــ نمبردار نے بیان دیتے ہوئے کہا ــــ "میں اب بھی کہتا ہوں کہ منظور کو کسی چڑیل نے مارا ہے۔"

"تو اُس کے منہ میں کسی جانور کی کلیجی کا ٹکڑا تمہارے باپ نے دیا تھا؟" ــــ زرگل نے اپنے پٹھانی انداز میں کہا۔

"جناب خان صاحب!" ــــ نمبردار نے کہا ــــ "یہ تو غیب کی باتیں ہیں۔ میں کم عقل آدمی کیا کہہ سکتا ہوں۔ جنوں اور چڑیلوں کے اپنے طور طریقے ہیں۔"

"تم کم عقل نہیں" ــــ زرگل نے کہا ــــ "تم بے ایمان ہو۔ میں جو کچھ پوچھتا ہوں اُس کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ بار بار مت کہو کہ اُس کو چڑیل نے مارا ہے۔"

"خان صاحب!" ــــ نمبردار نے غلاموں کی طرح ہاتھ جوڑ کر کہا ــــ "میں آپ کی جوتیوں کا غلام ہوں۔ اگر آپ مجھ سے اپنی مرضی کا بیان لینا چاہتے ہیں تو میں آپ کا حکم بجا لاؤں گا۔ میں چڑیل کا نام بار بار اس واسطے لیتا ہوں کہ منظور نے میرے آگے رونا رو دیا تھا کہ ایک چڑیل اُس کو تنگ کرتی ہے۔"

"تنگ کس طرح کرتی تھی؟" ــــ زرگل نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"میں جناب کو وہ بات سُنا رہا ہوں جو منظور نے میرے ساتھ کی تھی" ــــ نمبردار نے کہا ــــ "ڈیڑھ پونے دو مہینے کی بات ہے۔ منظور نے پریشانی کی حالت میں مجھ کو کہا کہ وہ جہاں کہیں اکیلا ہوتا ہے ایک عورت اُس کے سامنے آجاتی ہے اور اُس کو پیار محبت پر مجبور کرتی ہے۔ پہلے پہل یہ عورت اُس کو کھیتوں میں ملی تھی۔ منظور نے اُس کو ٹال دیا تھا۔"

"منظور نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ آتی کہاں سے تھی؟" ــــ زرگل

نے پوچھا ـــــ "اور چلی کہاں جاتی تھی؟"

"وہ کہتا تھا کہ وہ اس کو کوئی اجنبی عورت سمجھتا تھا" ـــــ نمبر دار نے جواب دیا ـــــ "وہ اس طرح سامنے آتی تھی جیسے فصل میں سے نکلی ہو پھر وہ پیٹھ پھیر کر چلی جاتی تھی اور فصل میں کہیں غائب ہو جاتی تھی۔ منظور کہتا تھا کہ وہ بہت خوبصورت عورت ہے۔ ایک روز منظور نے دیکھا تو اُس کا خون خشک ہو گیا۔ اس عورت کے پاؤں اُلٹے تھے اور جب اُس نے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو وہ بھی اُلٹے تھے۔ اُس کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں لیکن غور سے دیکھا تو یہ ذرا ترچھی نظر آئیں.... اب تو منظور اس کے ساتھ جائز یا ناجائز دوستی لگا ہی نہیں سکتا تھا۔"

"تم یہ بتاؤ" ـــــ زر گل نے نمبر دار سے پوچھا ـــــ "منظور کو کون سا سُرخاب کا پَر لگا ہوا تھا کہ چڑیل اُس پر عاشق ہو گئی تھی؟"

"خان صاحب!" ـــــ نمبر دار نے کہا ـــــ "آپ سُرخاب کا پَر کہتے ہیں۔ اگر آپ اُس کو دیکھتے تو آپ ضرور کہتے کہ یہ تو بہت ہی خوبصورت جوان ہے۔ خوبصورتی کے علاوہ اُس کی آواز اونچی اور سُریلی تھی۔ رات کو جب وہ ہیر وارث شاہ یا سیف الملوک گاتا تھا تو مسافر رُک جاتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گاؤں کی عورتیں اُس کو رُک کر دیکھتی تھیں۔ پھر اُس میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ دو من کا پتھر اُٹھا کر سر سے اُوپر لے جاتا تھا۔ کبڈی کا اتنا زبردست کھلاڑی تھا کہ اُس کو کوئی گرا نہیں سکتا تھا۔ آپ نے اُس کی لاش کفن میں لپٹی ہوئی دیکھی تھی۔ اُس کا چہرہ کلیجہ باہر آنے کی وجہ سے بگڑا ہوا تھا۔ آپ اُس کا جسم دیکھتے تو کہتے کہ یہ ایک جوان مرد کا جسم ہے۔"

زر گل کے دل میں ایک اور شک آ گیا۔ اگر گاؤں کی عورتیں مقتول کو رُک کر دیکھتی تھیں تو ایسا ہوا ہو گا کہ کسی عورت کے ساتھ مقتول کے تعلقات بن گئے ہوں گے اور وہ اسی وجہ سے مارا گیا ہو گا۔ یہ بات زر گل نے بعد میں معلوم کرنا تھی۔ پہلے اُس نے نمبر دار کا بیان لینا تھا۔ اُس نے نمبر دار کو کہا کہ وہ اپنا بیان جاری رکھے۔

"پھر خان صاحب ایسے ہُوا" — نمبردار نے کہا — "کہ فصل کٹ کر کھلیانوں میں آ گئی۔ اس کے خشک ہونے میں ابھی دن لگنے تھے۔ لوگ اپنا ایک ایک آدمی اپنے کھلیانوں میں رکھوالی کے لیے سُلاتے تھے۔ منظور اپنے کھلیان میں خود سویا تھا۔ پہلی رات وہ کھلیان میں سویا تو صبح ہوتے ہی میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ رات کو چڑیل اُس کے پاس آئی تھی۔ وہ عورت کے روپ میں تھی۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گئی اور کہنے لگی کہ میں ساری رات تمہارے ساتھ گزاروں گی۔ منظور ڈرتا رہا اور اُس کی مِنّتیں کرتا رہا، لیکن چڑیل صبح کی اذان تک اُس کے پاس رہی.....

"میں اُس کو شاہ جی کے پاس لے گیا۔ شاہ جی نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا اور کہنے لگا کہ اُن کو اس چڑیل کی جھلک منظور کی آنکھوں میں نظر آ رہی ہے۔ شاہ جی کہتے تھے کہ وہ اس چڑیل کو جانتے ہیں۔ یہ بڑی بدمعاش اور خطرناک چڑیل ہے۔ شاہ جی نے یہ بھی بتایا کہ کسی زمانے میں کسی گاؤں میں ایک بڑی خوبصورت اور جوان ہندو عورت ہوتی تھی جس کا نام رام پیاری تھا۔ اُس کا خاوند جوانی میں مر گیا تھا۔ ہندو عورت بیوہ ہو جائے تو اُس کی دوسری شادی نہیں ہو سکتی۔ اُس نے منظور جیسے ایک خوبصورت جوان مرد کے ساتھ درپردہ یارانہ لگا لیا تھا۔ وہ آدمی شادی شدہ تھا۔ اُس کے سالوں نے رام پیاری کو قتل کر دیا تھا۔ اس کے دو تین مہینے بعد لوگوں کو ویرانوں میں کسی عورت کے رونے کی اور بین کرنے کی آوازیں سُنائی دیتی تھیں۔ رات کو اکیلے مسافر کو تو وہ چھوڑتی ہی نہیں تھی.....

"شاہ صاحب بتلاتے ہیں کہ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب انگریز نئے نئے آئے تھے۔ رام پیاری پہلے بدروح تھی اس کے بعد چڑیل بن گئی۔ شاہ جی کے قبضے میں بڑے بڑے اکھڑ جنّ ہیں لیکن یہ چڑیل ان کے قبضے میں نہیں آئی۔ پھر شاہ جی نے منظور کو تعویذ دیے تھے۔ اُس نے ایک تعویذ بازو سے باندھ لیا تھا اور دوسرا گلے میں لٹکایا تھا لیکن رات کو بھی چڑیل آئی اور دونوں تعویذ اُتار کر لے گئی۔ منظور نے مجھ کو بتایا

تو میں اُس کو پھر شاہ جی کے پاس لے گیا۔ شاہ جی نے دو تعویذ لکھے اور پانی میں گھول کر منظور کو پلا دیے۔ ان تعویذوں کا بھی کچھ اثر نہ ہُوا۔ شاہ جی نے منظور کو تاکید کی تھی کہ وہ اس چڑیل کے ساتھ کسی قسم کا تعلق قائم نہ کرے۔ اگر کیا تو وہ اندر سے سُوکھ جائے گا پھر اُس کی اولاد نہیں ہو گی۔"

سب انسپکٹر نذر گل خان نے مجھ کو بتایا کہ جب نمبردار یہ بیان دے رہا تھا تو نذر گل بالکل خاموشی سے سُنتا رہا بلکہ اُس نے نمبردار کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ بولتا جائے۔ اسی سے قاتل تک پہنچنے کے واسطے اشارے ملنے تھے۔

"خان صاحب!" — نمبردار نے نذر گل خان کو بیان دیتے ہوئے کہا — "شاہ جی نے مجھ کو بتا دیا تھا کہ منظور بڑے خطرناک چکر میں پھنس گیا ہے۔ اگر یہ رام پیاری کی بات مانتا ہے تو بھی اس کی قسمت میں موت ہی لکھی ہے۔ چڑیل نے اس کو زندہ نہیں چھوڑنا تھا..... خان صاحب! منظور نے مجھ کو مرنے سے تین روز پہلے بتایا تھا کہ چڑیل نے اُس کو کہا ہے کہ وہ اُس کی محبت کو قبول نہیں کرے گا تو وہ اُس کا کلیجہ منہ کے راستے نکال دے گی۔ چڑیل نے اُس کو یہ بھی کہا تھا کہ وہ شاہ جی کے پاس نہ جایا کرے۔ وہ کہتی تھی کہ میں ہندو ہوں، مجھ پر تمہارے شاہ کے تعویذوں کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ پھر وہی ہُوا۔ وہ اُس کے پاس آئی اور یہ ڈر کر یا اُس سے جان چھڑانے کے لیے بھاگ اُٹھا۔ چڑیل نے اُس کو پکڑ کر اُس کا کلیجہ منہ کے راستے باہر نکال دیا۔"

"اس کا مطلب یہ ہُوا" — نذر گل خان نے کہا — "کہ تم کو معلوم ہے کہ وہ چارپائی سے اُٹھ کر بھاگا اور چڑیل نے اُس کو جا کر پکڑ لیا۔ مجھ کو یہ بتاؤ کہ اُس کی لاش کہاں پڑی ہوئی تھی؟"

"چارپائی پر خان صاحب!" — نمبردار نے جواب دیا۔

"چارپائی سے کتنی دُور جا کر چڑیل نے اُس کو پکڑا تھا؟"

"یہ تو میں نہیں بتا سکتا خان صاحب!" — نمبردار نے جواب دیا۔

"پھر تم یہ کس طرح بتا سکتے ہو کہ وہ بھاگا تھا؟"

"یہ میرا قیاس ہے" ___ نمبردار نے جواب دیا۔

"تم باہر جا کر بیٹھو" ___ زرگل نے کہا ___ "ٹھیک طرح سوچو۔ میں تم سے پھر کچھ پوچھوں گا۔ مجھ کو اُمید ہے کہ تمہارا قیاس بدل جائے گا۔۔۔ تم گاؤں کے نمبردار ہو اور تم کو اتنا بھی پتہ نہیں کہ گاؤں میں کس کے کس عورت کے ساتھ غلط تعلقات ہیں۔ مجھ کو شک ہے کہ منظور کے تعلقات کسی عورت کے ساتھ ضرور ہوں گے۔"

"نہیں خان صاحب!" ___ نمبردار نے کہا ___ "میں یہ نہیں کہتا کہ منظور کے تعلقات کسی کے بھی ساتھ نہیں تھے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ مجھ کو معلوم نہیں" ___ اس نے کچھ سوچ کر دو آدمیوں کے نام لیے اور کہنے لگا ___ "ان دونوں کے ساتھ منظور کا اُٹھنا بیٹھنا زیادہ تھا۔ آپ ان کو بلا لیں۔ وہ آپ کو صحیح بات بتائیں گے۔"

نمبردار کو اُٹھا کر زرگل نے ان دونوں آدمیوں کو تھانے میں فوری طور پر طلب کیا۔ اُس کے اے ایس آئی نے اُس کو بتایا کہ یہ دونوں اپنے پکے مخبر ہیں۔ دونوں رہزنی کے جرم میں ایک ایک سال قید کی سزا کاٹ چکے تھے۔

ان دونوں آدمیوں کے آنے میں خاصا وقت لگنا تھا۔ اس دوران زرگل تھوڑا آرام کرنے کے واسطے اپنے گھر چلا گیا۔ صبح کے وقت واپس تھانے میں آیا۔ وہ دونوں آدمی تھانے میں آئے ہوئے تھے۔ زرگل نے ان دونوں کے بیان الگ الگ لیے۔ دونوں کے بیان آپس میں ملتے تھے اور ان سے نمبردار کے بیان کی تصدیق ہوتی تھی۔ ان دونوں سے جو باتیں معلوم ہوئیں وہ یہ تھیں کہ مقتول کے تعلقات کسی عورت کے ساتھ نہیں تھے۔ اس کو اپنی بیوی کے ساتھ محبت تھی یا اپنے جسم کے ساتھ۔ اپنے جسم پر اُس نے بہت محنت کی تھی۔ اُس کا جسم کسرتی تھا جس کو کمایا ہوا جسم کہتے ہیں۔ دونوں نے بتایا کہ منظور نے اُن کو پریشانی کی حالت میں بتایا تھا کہ ایک چڑیل اُس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے اور شاہ جی کے تعویذ اُس پہ کوئی اثر نہیں کر رہے۔ زرگل نے ان دونوں کو کہا تھا کہ انہوں نے منظور کو یہ مشورہ کیوں

نہیں دیا تھا کہ وہ کھلیان میں نہ سویا کرے اور کسی اور کو سُلا دیا کرے۔ اُن میں سے ایک نے بتایا کہ چڑیل نے اُس کو کہا تھا کہ وہ جس رات گھر سوئے گا اُس رات وہ اُس کی بیوی کا کلیجہ منہ کے راستے نکال دے گی۔ منظور بیچارہ اپنی بیوی کو مروانا نہیں چاہتا تھا۔

ان دونوں کے بیان لے کر زرگل شاہ جی کے پاس چلا گیا۔ اُس کا گھر مقتول کے گاؤں کے بالکل ساتھ تھا جہاں اُس نے اپنی الگ دنیا بسائی ہوئی تھی۔ یہ ایک قلعے کی طرح کشادہ حویلی تھی۔ زرگل نے مجھ کو بتایا کہ وہ جب شاہ جی کے گھر میں اُس کے سامنے گیا تو شاہ جی نے اُس کا استقبال اس طرح رُوکھے سے طریقے سے کیا جیسے زرگل اس کا ادنیٰ سا مُرید ہو۔

"شاہ جی!" ـــــ زرگل نے اُس کو کہا ـــــ "منظور پر آپ کے تعویذوں نے اثر کیوں نہیں کیا؟"

"جناب خان صاحب!" ـــــ شاہ جی نے مستانی سی آواز میں کہا ـــــ "آپ کے سوال کا جواب تو میں بعد میں دوں گا۔ اس سے پہلے میں آپ کو خبردار کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ نے اپنے اوپر ایک خوفناک خطرہ لے لیا ہے۔"

"کیا یہ چڑیل مجھ کو نقصان پہنچائے گی؟"

"ہاں خان صاحب!" ـــــ شاہ جی نے کہا ـــــ "جس جسم کی آپ نے ڈاکٹروں سے چیر پھاڑ کروائی ہے، اُس جسم کے ساتھ چڑیل کو بہت محبت تھی۔ آپ نے اُس جسم کی بے حرمتی کی ہے۔"

"شاہ جی!" ـــــ زرگل خان نے کہا ـــــ "اگر اُس کو منظور کے جسم کے ساتھ اتنی زیادہ محبت تھی تو پھر اُس کو کیوں مارا؟"

"منظور جسم کو مرا ہوا نظر آتا ہے" ـــــ شاہ جی نے کہا ـــــ "ہم نے اُس کو دفن کر دیا ہے لیکن اُس کی رُوح کہیں نہیں گئی۔ وہ رام پیاری کے پاس ہے۔۔۔۔ خان صاحب! آپ اپنا مغز نہ کھپائیں۔ یہ ایک علم ہے جس کو آپ نہیں سمجھ سکتے۔ میں نے ریاضت کیا ہے۔ چلّے کاٹے ہیں۔ بڑے بڑے جِن بس کیے ہیں۔ پھر کہیں جا کر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھ کو باپ کی پیری فقیری

رہی ہے۔ اتنی محنت کے باوجود یہ چڑیل میرے ہاتھ نہیں آئی۔ نمبردار منظور کو میرے پاس لایا کرتا تھا۔ میرے تعویذ بیکار ہو گئے تھے۔ مجھ کو پتہ چل گیا تھا کہ منظور کا خاتمہ قریب ہے۔ میں اُس کو نہیں بچا سکتا تھا..... میں خود آپ کے پاس آنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ ایک تو آپ نے چڑیل کے ملے ہوئے آدمی کی میت کی بے حرمتی کی پھر آپ نے باقاعدہ تفتیش شروع کر دی۔ چڑیل یہ سمجھ رہی ہے کہ آپ اُس کے خلاف کارروائی کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیا آپ اس چڑیل کو حاضر کر سکتے ہیں؟" ــــــ زرگل نے پوچھا ــــــ "اگر حاضر کر سکتے ہیں تو کیا میں اُس کے ساتھ بات کر سکتا ہوں؟"

"آپ اُس کو کیا کہیں گے؟"

"میں اُس کو کہوں گا کہ اپنی زبان سے کہہ دے کہ منظور کو اُس نے مارا ہے" ــــــ زرگل خان نے کہا ــــــ "میرا شک رفع ہو جائے گا اور میں تفتیش بند کر دوں گا۔"

"آگ کے ساتھ مت کھیلو خان صاحب!" ــــــ شاہ جی نے کہا ــــــ "مجھ کو آپ کی ذات کے ساتھ دلچسپی ہے۔ آگے آپ اپنی مرضی کے خود مالک ہیں۔ آپ حاکم ہیں۔ وہ جو مر گیا ہے اُس کو میں نہیں بچا سکا۔ آپ کو بچا سکتا ہوں۔ آپ کو خبردار کرنا میرا فرض تھا وہ میں نے ادا کر دیا ہے۔"

"اگر میں یہ کہوں کہ یہ چڑیل نہیں تھی!" ــــــ زرگل نے کہا۔

"میں آپ کو زبردستی تو نہیں منوا سکتا خان صاحب!" ــــــ شاہ جی نے کہا۔

"میں آپ کو بتاتا ہوں" ــــــ زرگل نے کہا ــــــ "منظور کے منہ میں اُس کا اپنا کلیجہ نہیں تھا۔ وہ بھیڑ بکری کی کلیجی کا ٹکڑا تھا اور منظور کو گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔"

شاہ جی نے زرگل کو عجیب و غریب دلیلیں دے کر منوانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانا۔

"پھر مجھ کو بتائیں کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں" ــــــ شاہ جی نے کہا ــــــ "اگر وہ کسی اور کے ہاتھوں قتل ہوا ہے تو تفتیش جاری رکھیں۔ میں آپ کے واسطے سچے دل سے دعا کروں گا۔"

زرگل شاہ جی کے پاس نمبردار کے بیان کی تصدیق کرانے گیا تھا جو اُس نے کرلی کہ نمبردار منظور کو شاہ جی کے پاس لے گیا تھا۔ زرگل کو یہ تو یقین تھا کہ منظور قتل ہُوا ہے اور چڑیل کی محبت اور عاشقی کے قصے توہم پرستی ہے لیکن اُس کو قتل کا باعث معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ اُس نے جب نمبردار کی زبانی یہ سُنا کہ منظور کشش والا جوان آدمی تھا تو اُس کے دل میں یہ شک بیٹھ گیا کہ وہ کسی عورت کے پیچھے قتل ہُوا ہے۔

بیویاں اپنے خاوندوں کی جاسوسی کرتی رہتی ہیں۔ ہر بیوی کو شک ہوتا ہے کہ اُس کا خاوند خفیہ خفیہ دوسری عورت کے ساتھ یارانے لگاتا ہے۔ منظور جیسے پُرکشش آدمی کی بیوی کو تو زیادہ شک ہونا چاہیئے تھا۔ یہ سوچ کر اُس نے منظور کی بیوی کو تھانے بُلا لیا۔

یہ عورت جس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال تھی۔ کوئی خاص خوبصورت نہیں تھی۔ گندمی رنگ تھا۔ نقش اچھے تھے اور جسم بھی اچھا تھا۔ رو رو کر اُس کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں۔

"میں تمہارے خاوند کو زندہ نہیں کر سکتا"۔۔۔ زرگل خان نے اُس کو کہا۔۔۔ "اُس کے قاتل کو پھانسی دلا سکتا ہوں۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ اُس کو کس نے قتل کیا ہے؟"

"کوئی چڑیل تھی"۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔ "آپ چڑیل کو پھانسی نہیں دے سکتے"

"یہ جھوٹ ہے"۔۔۔ زرگل نے کہا۔۔۔ "اُس کا گلا دبا کر اُس کو قتل کیا گیا ہے اور اُس کے منہ میں بکری کی کلیجی کا ٹکڑا تھا۔"

"سب کہتے ہیں کہ اُس کو چڑیل نے مارا ہے"۔۔۔ بیوی نے کہا۔۔۔ "میں کیسے کہہ دوں کہ اُس کو چڑیل نے نہیں مارا؟"

زرگل نے دیکھا کہ وہ اپنے وہم سے ہٹتی ہی نہیں تو اُس نے اُس عورت سے پوچھا کہ منظور کا چال چلن کیسا تھا۔ اُس نے کہا کہ منظور پر اُس کو شک نہیں تھا۔

"سُنا ہے گاؤں کی عورتیں اُس کو بہت چاہتی تھیں"۔۔۔ زرگل نے کہا۔۔۔ "کوئی ایسی عورت یا جوان لڑکی ہوگی جو اُس کو بہت چاہتی ہوگی۔۔

ذرا سوچ کر جواب دو۔"

اُس نے بہت سوچا اور کہا کہ اُس کو کسی لڑکی پر بھی شک نہیں۔

"تم کو اُس نے بتایا ہو گا کہ ایک چڑیل اُس کو عورت کے روپ میں ملتی ہے" ۔۔۔ زرگل نے کہا۔

"اُس نے میرے ساتھ کبھی ایسی بات نہیں کی تھی" ۔۔۔ اُس نے کہا۔

"وہ ڈرا ڈرا رہتا ہو گا" ۔۔۔ زرگل نے کہا۔

"نہیں جی!" ۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "میں نے اُس کو کبھی بھی ڈرا ہوا نہیں دیکھا۔"

"پریشان سا اور گھبرایا ہوا بھی نہیں رہتا تھا؟"

"نہ جی!" ۔۔۔ مقتول کی بیوی نے جواب دیا ۔۔۔ "وہ تو خوش رہنے اور خوش رکھنے والا آدمی تھا۔"

زرگل اس عورت کے بیان پر بہت حیران ہو رہا تھا۔ اُس نے یہ خیال کیا کہ یہ عورت اپنے خاوند کے غم میں نڈھال ہے اور اس کا دماغ صحیح نہیں سوچ رہا۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ جو مر جائے اُس پر کوئی الزام نہیں لگانا چاہیئے۔ زرگل نے منظور کی بیوی کو پھر کسی وقت بلانے کا فیصلہ کیا اور اُس کو گاؤں بھیج دیا۔

سب انسپکٹر زرگل خان دو تین مخبروں سے پوچھتا رہا لیکن اُس کو کوئی سراغ والی بات نہ ملی۔ اُس نے مجھ کو مکمل سنایا تھا کہ کس آدمی یا عورت سے اُس نے کیا پوچھا تھا۔ میں نے اچھی طرح محسوس کر لیا کہ وہ گہرائی میں نہیں جا رہا تھا۔ میں نے اُس کو بتایا کہ وہ کیا غلطیاں کر تا رہا ہے۔

اتنے میں اُس کو ایسا صدمہ پہنچا کہ اُس کو اپنی بھی ہوش نہ رہی۔ اُس کا ایک بیٹا تھا جس کی عمر گیارہ برس تھی۔ تھانے والے گاؤں سے تھوڑی دور ایک ندی گزرتی تھی جس کا پانی گہرا نہیں تھا۔ لڑکے اس میں نہانے کے واسطے یا ایسا سمجھو کہ پانی میں کھیلنے کے واسطے چلے جایا کرتے تھے۔ زرگل کا بیٹا بھی جایا کرتا تھا۔ موسم ابھی اتنا زیادہ گرم نہیں ہوا تھا۔

پھر بھی لڑکوں نے ندی پر جانا شروع کر دیا تھا۔

تھانیدار کی بیوی تھانیدارنی نہیں ہوتی، ڈی ایس پی ہوتی ہے اور تھانیدار کا بیٹا ایس پی سے کم نہیں ہوتا۔ زر گل نے خود ہی مجھ کو بتایا کہ اُس نے اپنے بیٹے کو بہت بگاڑ دیا تھا۔ وہ بیٹے کو اب کنٹرول میں لانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اب پانی سر سے گزر گیا تھا۔ اُس نے لڑکے کو مارا پیٹا بھی تھا لیکن لڑکا اور زیادہ ڈھیٹ ہو گیا تھا۔ گاؤں میں اُس نے کیا خرابی کرنی تھی۔ وہ سکول سے بھاگ جاتا تھا۔ ماسٹروں پر باپ کی تھانیداری کا رُعب جماتا تھا اور کھیل کود کا زیادہ شوقین تھا۔ اُس کا من پسند کھیل ندی میں نہانا، تیرنا اور پانی میں کودنا تھا۔ اپنے جیسے لڑکوں کو ساتھ لے کر ندی پر چلا جاتا تھا۔

ایک روز وہ ندی پر گیا اور واپس نہ آیا۔ زر گل نے ایک کانسٹیبل کو ندی پر بھیجا کہ بچے کو ندی سے لے آئے۔ کانسٹیبل پریشانی کی حالت میں واپس آیا۔ اُس کے ساتھ تین چار اسی کی عمر کے لڑکے تھے۔ کانسٹیبل کے ہاتھ میں زر گل کے بیٹے کے کپڑے تھے۔ لڑکا ساتھ نہیں تھا۔ زر گل نے جب اپنے بیٹے کے کپڑے دیکھے اور اُس کو کانسٹیبل کے ساتھ اپنا بیٹا نظر نہ آیا تو اُس کو غشی آنے لگی۔

لڑکے جو کانسٹیبل کے ساتھ آئے تھے انہوں نے بتایا کہ ضمیر گل (زر گل کا بیٹا) اُن کے ساتھ تھا۔ وہ سب پانی میں کھیلتے اور ناچتے کودتے رہے۔ بہت وقت بعد انہوں نے دیکھا کہ ضمیر گل ان میں نہیں۔ سب نے اُس کو تلاش کیا مگر وہ نہ ملا۔ اُس کے کپڑے اور چپل وہاں پڑے ہوئے تھے جہاں سب لڑکوں نے اُتار کر رکھے تھے۔

زر گل اس خیال سے اٹھ کر دوڑ پڑا کہ ضمیر گہرے پانی میں چلا گیا ہو گا۔ بچے کم گہرے پانی میں کھیلا کودا کرتے تھے۔ میں نے بعد میں یہ ندی دیکھی تھی جہاں بچے نہایا کرتے تھے۔ وہاں سے چالیس پینتالیس قدم آگے ندی مڑتی تھی۔ موڑ تقریباً نوّے درجے زاویے کا تھا۔ دونوں کناروں پر چٹانیں تھیں جو ریتلی بھی تھیں اور پتھریلی بھی۔ پانی سامنے والی چٹان کے

ساتھ ٹکرا کر مڑتا تھا اور وہاں پانی گہرا تھا۔ ندی زمین کی عام سطح سے نیچے تھی۔ کنارے ڈھلانی تھے۔ ڈھلانوں پر درخت تھے اور اونچی گھاس بھی تھی۔

زر گل ندی پر پہنچا۔ اُس کے پیچھے پیچھے ایک ہیڈ کانسٹیبل اور کچھ آدمی گاؤں کے بھی جن کو پتہ لگا کہ تھانیدار کا بچہ گم ہو گیا ہے، ندی پر پہنچ گئے۔ زر گل باپ تھا وہ جاتے ہی ندی کے گہرے پانی میں کودنے لگا تو کسی نے اُس کو پکڑ لیا۔ دو تین آدمی گہرے پانی میں اُتر گئے۔ وہاں موڑ پر پانی کی زیادہ سے زیادہ گہرائی چھ فٹ تھی اور یہ تھوڑی سی جگہ تھی جہاں پانی گہرا تھا۔ اس سے آگے پانی کی گہرائی ختم ہو جاتی تھی۔

ان آدمیوں نے گہرے پانی کی اس تھوڑی سی جگہ میں تہہ تک جا جا کر ٹٹولا اور دیکھا۔ اُنہیں بچہ نہ ملا۔ ایک خطرہ یہ تھا کہ پانی جب چٹانوں کے نیچے ٹکرا کر مڑتا ہے تو چٹان کٹتی رہتی ہے اور ایک مدت کے بعد پانی کے نیچے ایک غار سی بن جاتی ہے جو آدمی اس سے واقف نہیں ہوتا وہ غلطی سے پانی کے بہاؤ کے ساتھ اندر چلا جائے تو نکل نہیں سکتا۔ نہ نکل سکنے کی وجہ یہ ہے کہ آدمی پانی سے اُبھرتا ہے تو اُس کا سر غار کی چھت کے ساتھ لگتا ہے اور اتنے زور سے لگتا ہے کہ غشی طاری ہو جاتی ہے۔ جو آدمی یہ سوچ سمجھ کر پانی میں ڈبکی لگا کر اندر جاتے ہیں کہ یہ پانی کا بنایا ہوا الموزرا غار ہے وہ صحیح سلامت باہر آجاتے ہیں اس کے اندر جب آدمی مرجاتا ہے تو لاش کو پانی باہر نہیں آنے دیتا۔

اس کام کے دو ماہر آدمی ڈبکی لگا کر چٹان کے نیچے چلے گئے۔ باہر آکر انہوں نے بتایا کہ اندر کچھ بھی نہیں۔ مختصر یہ کہ ہر طرح کوشش کی گئی لیکن بچے کا نشان تک نہ ملا۔ آپ اندازہ کر سکتے ہوں گے کہ زر گل کا کیا حال ہوا ہو گا۔ اُس کا تو دماغ ہی خراب ہو گیا تھا۔ اُس نے دو تین کانسٹیبلوں اور گاؤں کے چار پانچ آدمیوں کی یہ ڈیوٹی لگا دی کہ وہ پانی میں ڈبکیاں لگاتے رہیں اور بچے کو نکالیں۔ اُس کے حکم کی تعمیل میں ان آدمیوں کے علاوہ کئی اور آدمی وہ سارا دن اور پوری رات پانی میں ڈبکیاں لگاتے رہے۔ صبح ہوتے ہی زر گل پھر ندی پر پہنچ گیا۔ جب سب نے اُس کو کہا کہ لڑکا پانی میں

نہیں تو اُس نے یقین کر لیا۔ اُس کے بچے کے ساتھ کھیلنے والے لڑکوں میں سے دو نے بتایا تھا کہ وہ ندی کے اگلے موڑ کی طرف چلا گیا تھا۔ پھر اُس کو ادھر آتے کسی نے نہیں دیکھا۔ ان بچوں نے یہ بھی بتایا کہ اُن میں سے کبھی کوئی گہرے پانی کے قریب بھی نہیں گیا تھا۔

میں جس روز چارج لینے کے واسطے اس تھانے میں گیا، اس بچے کو لاپتہ ہوئے چار یا پانچ دن گزر گئے تھے۔ زرگل منظور کے قتل کو تو بھول ہی گیا تھا۔ ان چار پانچ دنوں میں اُس نے تفتیش ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھائی تھی۔ اُس کو تبادلے کا حکم مل چکا تھا۔ اُس نے درخواست لکھ کر علاقہ ڈی ایس پی کو دستی جا کر دی تھی اور اُس کو زبانی بھی کہا تھا کہ وہ بچے کی تلاش کے واسطے نئے تھانیدار کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اُس کو کم از کم ایک ماہ کی چھٹی دے دی جائے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مجھ کو ابھی اس تھانے میں نہ بھیجا جاتا لیکن بالائی افسروں نے زرگل کی ذہنی حالت دیکھ کر اُس کو ایک مہینے کی چھٹی دے دی اور مجھ کو اس تھانے کا چارج لینے کے واسطے بھیج دیا۔ میں سب سے پہلے علاقہ ڈی ایس پی کے پاس گیا تھا جو دستور تھا۔

"دیکھو محبوب عالم!"۔۔۔ اس انگریز ڈی ایس پی نے مجھ کو کہا تھا ۔۔۔ "ہم نے تمہارا تبادلہ روکا نہیں اور سب انسپکٹر زرگل کو چھٹی دے دی ہے۔ اس کا بچہ لاپتہ ہے اس وجہ سے اس کا دماغ ٹھیک کام نہیں کرتا۔ ہم نے اس کی تسلی کے واسطے اس کو چھٹی دی ہے۔ ہمیں اس کیس کی جو رپورٹ زرگل کے تھانے سے ملی ہے اس سے ہمیں اس طرح شک ہوتا ہے کہ زرگل کا بچہ کسی انتقامی کارروائی کے تحت لاپتہ کر دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے قتل کی ایک واردات ہوئی ہے جس کو تمہارے لوگوں نے عجیب و غریب واردات بنا دیا ہے"۔۔۔ ڈی ایس پی نے مسکرا کر مجھ سے پوچھا ۔۔۔ "کیا تم مانتے ہو کہ چڑیلیں اس طرح کسی کو مار دیتی ہیں جس طرح ایک آدمی مارا گیا ہے؟"

"نہیں صاحب!"۔۔۔ میں نے جواب دیا ۔۔۔ "میں نے کبھی قتل کی ایسی

واردات نہیں دیکھی جس میں قاتل کوئی چڑیل یا بد روح ہو؟"
"پھر تم اس کیس کی تفتیش کر لو گے"۔۔۔ ڈی ایس پی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

زر گُل جب اپنے بچے کی بات کرتا تھا تو وہ دانت پیسنے لگتا تھا اور پھر اس کے آنسو نکل آتے تھے۔

"محبوب!"۔۔۔ اس نے جذباتی سے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔۔۔ "کیا تم میرے بچے کو کہیں سے لا سکتے ہو؟"

"بھائی زر گُل!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "تم نے ایسی بات کیوں کہی ہے؟ اس علاقے کی ساری آبادی قتل ہو جائے تو بھی میں سب سے پہلے تمہارے بچے کو تلاش کروں گا۔۔۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمہارے دل کا اور دماغ کا کیا حال ہو گیا ہے۔ اگر تم اپنا دماغ اپنے قابو میں رکھتے تو ان چار پانچ دنوں میں بچے کے قریب پہنچ سکتے تھے۔ بُرا محسوس نہ کرنا۔ تم نے قتل کی جو تفتیش کی ہے وہ بھی صحیح نہیں کی۔۔۔۔ مجھ کو ایک بات بتاؤ۔ کیا تم شاہ جی کے پاس نہیں گئے؟"

"کس واسطے؟"۔۔۔ اس نے پوچھا اور کہنے لگا۔۔۔ "میں ایک بار تو گیا تھا۔"

"وہ تو قتل کے سلسلے میں تھا"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "بچے کی گمشدگی کے بعد تم اس کے پاس اس مطلب سے جاتے کہ وہ اپنے آپ کو غیبی طاقت رکھنے والا پیر سمجھتا ہے تو تمہارے بچے کا اتہ پتہ بتا دے کہ وہ کہاں ہے۔"

"میں نہیں گیا"۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ "پرسوں رات میری بیوی نے مجھ کو بتایا تھا کہ وہ مجھ سے چوری شاہ جی کے پاس گئی تھی۔ مجھ کو یہ شک ہے کہ اس شاہ کے ہاتھ میں اپنے باپ کی گدی کے سوا کچھ بھی نہیں لیکن میری بیوی آخر بچے کی ماں ہے وہ چلی گئی۔ وہ گئی تو مجھ سے چوری تھی لیکن وفادار بیوی ہے اس واسطے اس نے مجھ کو بتا دیا۔"

"ہاں ہاں"۔۔۔ میں نے چونک کر کہا۔۔۔ "اب مجھ کو بتاؤ کہ تمہاری بیوی کو شاہ جی نے کیا کہا تھا۔"

"یہی میں تم کو بتلانے لگا تھا"۔۔۔ زر گُل نے کہا۔۔۔ "شاہ نے اس

کو کہا تھا کہ ابھی وہ نہیں بتا سکتا کہ بچہ زندہ ہے یا نہیں۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ تمہارے خاوند نے ایک ایسی مخلوق کو ناراض کر دیا ہے جو نظر نہیں آتی لیکن ہم سب کا بیڑا غرق کر سکتی ہے۔ شاہ نے یہ بھی کہا تھا کہ اپنے خاوند کو کہو کہ یہ تفتیش روک دے۔ شاہ نے مراقبے میں جا کر میری بیوی کو بعد میں یہ بتایا تھا کہ بچے کو اسی غیبی مخلوق نے انتقامی طور پہ غائب کیا ہے۔"

"زرگل!" ـــــ میرے منہ سے بے اختیار نکلا ـــــ "میں یہ نہیں بتا سکتا کہ بچہ زندہ ہے یا نہیں۔ میں یہ بتا دیتا ہوں کہ بچہ ڈوبا نہیں۔ اُس کو اغوا کیا گیا ہے اور اُس کو اس مطلب سے اغوا کیا گیا ہے کہ منظور کے قتل کی تفتیش رُک جائے۔ کیا تم نے یہ نہیں سوچا کہ منظور کو قتل کیا گیا ہے اور مشہور یہ کیا جا رہا ہے کہ اُس کو چڑیل نے مارا ہے؟ اس پر بھی غور کرو کہ شاہ نے پہلے تم کو پھر تمہاری بیوی کو کہا کہ تفتیش روک دو۔"

"کیا تم کو شاہ پر شک ہے؟" ـــــ زرگل نے پوچھا۔

"ضروری نہیں" ـــــ میں نے کہا ـــــ "فوری طور پہ جو شک میرے دماغ میں اُٹھا ہے وہ یہ ہے کہ بچے کو اغوا کیا گیا ہے۔"

"پھر میں شاہ کو تھانے نہ بلا لوں؟" ـــــ زرگل نے پوچھا۔

"ابھی نہیں" ـــــ میں نے کہا ـــــ "پہلے مجھ کو اُس جگہ لے چلو جہاں سے بچہ لاپتہ ہُوا ہے۔"

ہم اُس جگہ چلے گئے۔ وہاں مجھے کوئی کھُرا یا کوئی اور سُراغ یا اشارہ نہیں مل سکتا تھا۔ میں صرف ندی کے اُس تھوڑے سے حصے کو دیکھنا ضروری سمجھتا تھا جہاں سے بچہ لاپتہ ہُوا تھا۔ میں نے معلوم نہیں کس وجہ سے بلکہ کسے موڈ میں زرگل کو کہہ دیا کہ بچہ ڈوبا نہیں اُس کو اُٹھایا گیا ہے۔ تم ذرا دل پہ پتھر رکھو اور صبر کرو۔ میں منظور کے قتل کی تفتیش نئے سرے سے کروں گا۔ زرگل نے میری بات مان لی۔ میں نے ابھی تھانے کا چارج مکمل طور پہ نہیں لیا تھا۔ میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ زرگل کو کہا کہ وہ اُن تمام آدمیوں کو تھانے بلائے جن سے وہ پوچھ گچھ کر چکا ہے۔

اُس نے اُسی وقت ان سب کی جن میں مقتول کی ماں اور بیوی بھی شامل تھیں تھانے میں طلبی کا بندوبست کر دیا۔

جتنی دیر میں یہ لوگ آتے تھے میں نے کچھ اور چارج لے لیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ زرگل کا دماغ حاضر نہیں تھا۔ مجھ کو کبھی یہ خیال آتا کہ اُس کا بچہ زندہ ہے اور کبھی یہ کہ وہ مارا جا چکا ہے۔

سب سے پہلے نمبردار دو آدمیوں کے ساتھ آیا۔ اُن کو دُور سے دیکھ کر زرگل نے مجھ کو بتایا کہ یہ دونوں مخبر ہیں اور انہوں نے جو بیان دیا تھا وہ ہُو بہُو نمبردار کے بیان کے ساتھ ملتا تھا۔ میں نے نمبردار کو الگ کمرے میں بٹھا لیا۔ زرگل کو اپنے ساتھ نہ رکھا۔ میں نے نمبردار کے ساتھ اس طرح بات کی جیسے میں اناڑی اور ڈھیلا ڈھالا تھانیدار ہوں اور نمبردار کو دانش مند اور تجربہ کار آدمی سمجھتا ہوں۔

"میں تمہارے تجربے سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہوں"___ میں نے نمبردار کو کہا___"میں نے ابھی ابھی تھانے کا چارج لیا ہے۔ میں نمبرداروں پر بھروسہ کرنا چاہتا ہوں۔ تم جو کہو گے میں اِسی کو ٹھیک سمجھوں گا۔ تم سرکاری آدمی ہو اور اپنے گاؤں کے لوگوں کو جتنا تم سمجھتے ہو اتنا ابھی میں نہیں سمجھ سکتا.... منظور کے قتل کی بات کرو۔ کیا تم کو یقین ہے کہ اُس کو چڑیل نے مارا ہے؟"___ میں نے جھوٹ بولا___"میں نے چڑیلوں کے مارے ہوئے دو آدمی دیکھے ہیں۔"

"ہاں حضور!"___ اُس نے جواب دیا___"اُس کو چڑیل نے مارا ہے، لیکن خان صاحب نہیں مانتے۔"

"اُس کی بات نہ کرو"___ میں نے بناوٹی طنز سے کہا___"یہ پٹھان ہے خود دماغ ہے۔"

میں نے نمبردار کا چہرہ دیکھا۔ اُس کے چہرے سے وہ گھبراہٹ سی دُور ہو گئی تھی جو اُسے تھانیدار کی طلبی پر اُس کے چہرے پر آئی ہوئی تھی۔ اِس کی بجائے اُس کے چہرے پر رونق سی آ گئی۔ اُس نے میرے کہنے پر اپنا بیان شروع کر دیا۔ یہ وہی بیان تھا جو وہ زرگل کو دے چکا تھا۔ میں نے اپنے

طریقے سے جرح کی تو میرے دماغ میں مزید کچھ شک پیدا ہوئے۔
پھر اُن دونوں آدمیوں کو باری باری بلایا جو اس کے ساتھ آئے تھے۔ انہوں نے بھی وہی بیان دیئے جو زرگل مجھ کو سُنا چکا تھا اور اب نمبردار نے جو بیان دہرایا تھا۔ ان پر بھی میں نے جرح کی۔ دونوں میرے کئی سوالوں کے جواب تسلی بخش نہ دے سکے۔ زرگل جب مجھ کو ان سب کے بیان سُنا رہا تھا تو میں غور سے سُن رہا تھا۔ مجھ کو شک اسی وقت ہوا تھا کہ قتل کی اس واردات میں ان لوگوں کا بھی ہاتھ ہے۔ میں نے ان کو ابھی چھوڑنا نہیں تھا۔ میرے دماغ میں تفتیش کی ایک لائن آئی ہوئی تھی۔ میں اس کے مطابق اپنے دماغ کو استعمال کر رہا تھا۔
منظورہ کی بیوی بھی آگئی تھی اور اُس کی ماں بھی۔ میں نے پہلے ماں کو بلایا۔ اُس نے وہی جذباتی باتیں شروع کر دیں جو وہ پہلے زرگل کے ساتھ کر چکی تھی۔ میں اب اُس کو حقیقی باتوں کی طرف لانے کی کوشش کرنے لگا۔
"کیا تمہیں معلوم تھا کہ ایک چڑیل تمہارے بیٹے کے پیچھے پڑی ہوئی ہے؟" ——— میں نے اُس سے پوچھا۔
"ایک نہیں سینکڑوں" ——— ماں نے جواب دیا ——— "اُس کی آواز جہاں تک پہنچتی تھی وہاں تک لوگ کام دھندا چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔"
"ماں جی!" ——— میں نے جھنجھلائی ہوئی آواز میں کہا ——— "میں تمہارے بیٹے کی تعریفیں نہیں سُننا چاہتا۔ میں اُس کے قاتل کو پکڑنا چاہتا ہوں۔ میرے ساتھ ہوش کی باتیں کرو۔"
"لیکن قاتل تو چڑیل ہے" ——— اُس نے کہا ——— "اُس کو کیسے پکڑو گے؟"
"کیا یہ تمہارا اپنا خیال ہے؟" ——— میں نے اُس سے پوچھا ——— "یا تم کو کسی اور نے بتایا ہے؟"
"ساری دنیا کہتی ہے" ——— اُس نے جواب دیا ——— "شاہ جی بھی یہی کہتے ہیں۔ اُن کو تو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ چڑیل کون سی ہے اور کہاں رہتی ہے۔ وہ تو اُس کا نام بھی جانتے ہیں۔"
"کیا نام ہے؟"

"رام پیاری"___ اُس نے جواب دیا۔

"تمہیں شاہ جی نے خود بتایا تھا؟"

"نہیں"___ اُس نے جواب دیا___ "ہمارا گھر ایسا بے برکت ہے کہ شاہ جی نے یہاں آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہم سے ناراض ہیں"

"وہ کیوں؟"

"میرے بیٹے نے اُن کے ساتھ تعلق توڑ لیا تھا"___ اُس نے جواب دیا___ "میں تو کہتی ہوں کہ میرے بیٹے کو اسی کی سزا ملی ہے۔ پہنچ والے بزرگوں کی بے ادبی کرنے والے سکھی تو نہیں رہ سکتے۔"

"لیکن وہ خود تو شاہ جی کے پاس جایا کرتا تھا"___ میں نے کہا۔

"یہ بات صحیح نہیں ہو سکتی"___ اُس نے کہا___ "وہ نہ خود جاتا تھا نہ مجھے یا میری بہو کو جانے دیتا تھا۔ ایک وقت تھا جب بڑے شاہ جی زندہ تھے تو میں وہاں سلام کے لیے جایا کرتی تھی۔ گھر میں برکت بھی تھی۔ اب دیکھ لو بے ادبی کا نتیجہ۔ جوان بیٹا دو بچوں کا باپ ہاتھ سے گیا۔"

"ماں جی!"___ میں نے کہا___ "اس کی کوئی وجہ تو ہو گی۔"

"ہاں جی!"___ اُس نے جواب دیا___ "میرا بیٹا بڑا سیدھا لڑکا ہے۔ گاؤں کی مسجد کا پیش امام اُس کو بہت پسند کرتا تھا۔ اذان میرے بیٹے سے دلوایا کرتا تھا۔ اُس امام کی اور شاہ جی کی آپس میں کوئی کھٹ پٹ تھی۔ امام کے کہنے پر میرے بیٹے نے شاہ جی کی مریدی چھوڑ دی تھی اور اُن کے ساتھ سلام دُعا بھی ختم کر دی تھی۔"

جب یہ عورت یہ باتیں کر رہی تھی تو مجھ کو یاد آ رہا تھا کہ نمبردار نے اور اُس کے ساتھ آنے والے دو آدمیوں نے کہا تھا کہ وہ منظور کو شاہ جی کے پاس لے گئے تھے۔ ایک بار نہیں وہ کئی بار اُن سے تعویذ لینے کے واسطے گیا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ گیا ہو اور اُس نے اپنی ماں کو نہ بتایا ہو۔ میں نے ماں کو باہر بھیج کر منظور کی بیوی کو بُلایا۔ منظور کو قتل ہوئے کئی روز گزر گئے تھے۔ اُس کی بیوی اب کچھ ہوش و حواس میں تھی۔

میں نے اُس سے بھی پوچھا کہ اُس کو معلوم تھا یا نہیں کہ منظور کے

پیچھے کوئی چڑیل پڑی ہوئی تھی۔ اُس نے کہا کہ اُس کو معلوم نہیں۔

"اگر ایسی بات ہوتی تو وہ مجھ کو ضرور بتاتا"۔۔۔۔ مقتول کی بیوی نے کہا۔۔۔۔"ہماری آپس میں اتنی محبت تھی کہ وہ ذرا ذرا سی بات بھی مجھ کو بتا دیتا تھا۔"

"کیا وہ تمہیں بھی شاہ جی کے ہاں نہیں جانے دیتا تھا؟"

"شاہ جی کے ساتھ اس نے دُشمنی پیدا کر لی تھی"۔۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔۔"کہا کرتا تھا کہ اس شاہ کا باپ پہنچ والا تھا اور اُس کے ہاتھ میں صحیح پیری بھی تھی، لیکن یہ شاہ بدمعاش آدمی ہے۔"

"کیا تم نے مان لیا تھا کہ یہ شاہ جی بدمعاش آدمی ہے؟"

"توبہ کرو جی!"۔۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔۔"مجھ میں اتنی جرأت کہاں کہ میں اتنی بڑی گدی کی بے ادبی کرتی۔ میں تو اپنے خاوند کو ہی پیر سمجھتی تھی لیکن پیر مُرشد کے پیر کے خلاف میں کوئی بات سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"ایک بات بتاؤ"۔۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔۔"لیکن تم چھپا جاؤ گی۔۔۔ شادی سے پہلے یا شادی کے فوراً بعد تم شاہ جی کے ہاں جاتی ہو گی۔"

"ہاں جی!"۔۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔۔"میں کبھی کبھی جایا کرتی تھی۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ منظور کو کبھی شک ہوا ہو کہ شاہ جی کے ساتھ تمہارا تعلق کچھ ایسا ویسا ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ اُس کو ایسا شک کبھی نہیں ہوا تھا"۔۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔۔"کوئی ایسی ویسی بات بھی کبھی نہیں ہوئی تھی۔"

"اگر میں یہ کہوں کہ مرنے سے مہینہ ڈیڑھ مہینہ پہلے منظور شاہ جی کے پاس جاتا رہا ہے تو تم مان لو گی؟"

"نہیں"۔۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔۔"وہ ضد کا بڑا پکا تھا، میں بالکل نہیں مانوں گی کہ وہ وہاں گیا تھا۔"

❦

میں نے زرگل کو کہا کہ وہ ان کے گاؤں کے پیش امام کو بلا لے۔ میں نے نمبردار کو پھر بلایا۔

"تم منظور کو شاہ جی کے پاس لے جاتے رہے ہو" ـــــ میں نے کہا ـــــ "وہ تعویذ لینے کے واسطے اکیلا بھی جاتا ہوگا۔"

"ہاں حضور!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "وہ آتا جاتا رہتا تھا۔"

"تمہارے گاؤں کی مسجد کا پیش امام کیسا آدمی ہے؟"

"ٹھیک آدمی نہیں حضور!" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ ہم کو اب پتہ لگا ہے کہ وہ وہابی ہے۔"

"کیا وہ مانتا ہے کہ وہابی ہے؟"

"اپنی زبان سے نہیں مانتا" ـــــ نمبردار نے جواب دیا ـــــ "لیکن اُس کے طور طریقے وہابیوں والے ہیں۔ شاہ جی کے خلاف باتیں کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اسلام پیری مریدی کی اجازت نہیں دیتا.... ہم اُس کو مسجد سے نکال رہے ہیں۔ پردیسی کو جو کہ ہم نے اُس کو رکھ لیا تھا۔"

"یہ باتیں شاہ جی کے کانوں میں بھی پہنچی ہوں گی" ـــــ میں نے کہا ـــــ "پھر شاہ جی نے اُس کو مسجد میں کیوں رہنے دیا؟"

"شاہ جی بادشاہ آدمی ہیں" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "وہ کسی کا دل نہیں دکھانا چاہتے۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ اس گدی کی جس نے بے ادبی کی وہ اپنی سزا خود پالے گا۔"

"جیسی منظور نے پالی ہے" ـــــ میں نے کہا اور نمبردار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا پھر میں نے کہا ـــــ "اُس نے بھی شاہ جی کی مریدی سے توبہ کر لی تھی۔"

میں نے خاص طور پہ نوٹ کیا کہ نمبردار کی آنکھوں میں اور چہرے پر بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ اُس کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔

"اب میں تمہاری زبان سے سچ سننا چاہتا ہوں" ـــــ میں نے کہا ـــــ "سچ سچ بتاؤ کہ منظور کی شاہ جی سے کیا عداوت تھی۔"

"کوئی عداوت نہیں تھی حضور!" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "مرید اپنے پیر کے ساتھ کیسے عداوت رکھ سکتا ہے۔"

"سوچ کر بتاؤ" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "انگلیوں پر گن کر بتاؤ کہ تم

منظور کو کتنی بار شاہ جی کے پاس لے کر گئے تھے۔ تم کہتے ہو کہ وہ تمہارے بغیر بھی وہاں جاتا تھا۔ وہ کتنی بار وہاں گیا تھا؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"اچھی طرح سوچو" ـــ میں نے کہا ـــ "یاد کر کے مجھے بتاؤ۔"

"میں شاید تین مرتبہ اُس کو شاہ جی کے پاس لے گیا تھا" ـــ اُس نے کہا ـــ "شاید چار مرتبہ.... اور تین چار مرتبہ وہ خود وہاں گیا ہوگا۔"

"کیا وہ تم کو بتا کر جاتا تھا؟"

"کبھی کبھی بتا کر جاتا تھا" ـــ اُس نے جواب دیا۔

"اب میری بات کان کھول کر سُن لو چوہدری!" ـــ میں نے کہا ـــ "مجھ کو دو سوالوں کے جواب دے دو۔ ایک یہ کہ منظور کو کس نے قتل کیا ہے اور دوسرا یہ کہ خان صاحب کا لڑکا کہاں ہے۔"

یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ مجھ کو فوراً بتا دیتا۔ اُس نے انکار کیا اور یہ بھی کہا کہ میں معلوم نہیں کیوں اُس پر اتنا خوفناک الزام لگا رہا ہوں۔ جس انداز سے وہ انکار کر رہا تھا اُس انداز کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ اگر وہ قتل کی اس واردات میں شریک نہیں تھا اور زر گل کے بچے کے اغوا کا بھی اُس کو علم نہیں تھا تو بھی اُس نے اپنے خلاف میرے دل میں بڑا پکا شک پیدا کر دیا تھا۔

میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ اس نمبردار کو بارک کے کونے میں بٹھا دے اور اس کے ساتھ کوئی شخص بات نہ کرے۔ نمبردار کی گھبراہٹ دیکھنے والی تھی۔ وہ ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ جانے پر آمادہ نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ چلتا تھا اور دو قدم چل کر رک جاتا اور میری طرف دیکھتا تھا۔ میرے اشارے پر ہیڈ کانسٹیبل نے اُس کو بازو سے پکڑا اور باہر لے گیا۔

میں نے دو آدمیوں میں سے ایک کو بلایا جو نمبردار کے ساتھ آئے تھے۔ اُس کو میں نے بٹھایا نہیں۔ کھڑا رہنے دیا۔

"تم نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ منظور شاہ جی کے گھر جایا کرتا تھا" ـــ میں نے کہا ـــ "میں تم کو ایک موقع دیتا ہوں۔ سوچ کر جواب دو۔ کیا

وہ شاہ جی کے پاس تعویذ لینے جایا کرتا تھا؟"

"ہاں جناب!" ــــ اُس نے جواب دیا۔

"کیا تم تھانے کے مخبر ہو؟"

"ہاں حضور!" ــــ اُس نے جواب دیا۔

"سزا یافتہ ہو؟"

"ایک بار جناب!" ــــ اُس نے جواب دیا۔

"تم ایک بار پھر جیل جانے کی تیاری کر رہے ہو" ــــ مَیں نے اُس کو تین چار گالیاں دیں تاکہ وہ میری بات جلدی سمجھ جائے۔ مَیں نے کہا ــــ "باہر بیٹھ کر سوچو پھر مجھ کو بتانا کہ منظور شاہ جی کے پاس جاتا تھا یا نہیں" ــــ اور اُس کو باہر نکال دیا۔

دوسرے کو بُلایا اور اُس سے بھی یہی پوچھا کہ منظور شاہ جی کے گھر جایا کرتا تھا۔ اُس نے بھی کہا کہ جایا کرتا تھا۔ مَیں نے اُس کو بھی باہر نکال دیا اور منظور کی بیوی کو بلایا۔

"تمہیں معلوم ہوگا کہ تمہارے خاوند کے گہرے دوست کون کون تھے" ــــ مَیں نے اُس کو کہا ــــ "میرا مطلب ہے کہ ایسے آدمی جن کے ساتھ وہ دل کی باتیں بھی کرتا تھا"۔

اُس نے دو نام بتلائے اور کہا کہ ان دونوں کو وہ سگے بھائیوں سے بھی آگے سمجھتا تھا۔ مَیں نے اے ایس آئی کو ان دونوں کے نام بتا کر کہا کہ ان کو تھانے طلب کرے۔ مَیں زرگل کے پاس جا بیٹھا۔

"زرگل!" ــــ مَیں نے اُس کو کہا ــــ "قاتل جلد ہی مل جائے گا"۔

"مجھ کو اپنا بچہ چاہیئے محبوب خاناں!" ــــ زرگل نے غصے سے کہا۔ ــــ "بچے کو ڈھونڈو بچے کو۔ میرے ساتھ فالتو بات مت کرو"۔

وہ آرام سے تو بیٹھتا ہی نہیں تھا۔ مَیں آپ کو یہ نہیں سُنا رہا کہ وہ اپنے طور پر اپنے لڑکے کی تلاش میں کیا کچھ کر رہا تھا۔

"مَیں اپنے گھر جاتا ہوں تو بیوی پوچھتی ہے میرے بچے کو لے آئے؟" ــــ زرگل نے کہا ــــ "وہ اور کوئی بات ہی نہیں کرتی۔ کہتی ہے پٹھان کے

بچے ہو تو میرا بچہ لاؤ، نہیں تو میرے سامنے نہ آؤ۔"

میں اُس کو تسلی دینے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا؟
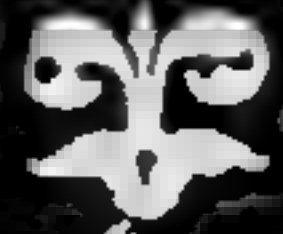
مقتول کے گاؤں کی مسجد کا امام آگیا۔ اُس کی ڈیل ڈول اور حلیہ دیہات کے مولویوں جیسا نہیں تھا۔ اُس کی عمر تیس سال سے ذرا کم یا ذرا زیادہ ہوگی داڑھی چھوٹی تھی اور اچھے طریقے سے تراشی ہوئی تھی۔ اُس کا جسم چست اور پھرتیلا لگتا تھا۔ میں نے اُس کو احترام سے بٹھایا۔

"محترم!"___ میں نے کہا___ "سنا ہے لوگ آپ کو وہابی کہتے ہیں ..... کیا آپ واقعی وہابی ہیں؟"

"میں صرف مسلمان ہوں جناب!"___ اُس نے جواب دیا___ "یہ لوگ مجھ کو وہابی کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ شاہ جی کسی کی بھی مدد نہیں کر سکتا۔ مشکل میں اور مصیبت میں خدا کو یاد کرو اور اُسی سے مدد مانگو مگر یہ لوگ پہلے پیر کا اس کے بعد خدا کا نام لیتے ہیں۔ یہ شاہ شریف آدمی نہیں۔ یہ اپنے آپ کو اور اپنے مرے ہوئے باپ کو شاہ ولی اللہؒ، نظام الدینؒ اور داتا گنج بخشؒ کے برابر سمجھتا ہے۔ یہ تو اولیائے کرام اور صوفیاء کے پاؤں کی خاک کے برابر بھی نہیں۔ یہ شاہ باز کا شکار کھیلتا ہے، کتوں سے شکار کھیلتا ہے اور کتے لڑاتا بھی ہے۔ شراب بھی پیتا ہے۔ میں لوگوں کو کہتا ہوں کہ اس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں اور یہ نوسرباز ہے۔ اس وجہ سے یہ شاہ بھی اور نمبردار بھی اور گاؤں کے زیادہ تر لوگ بھی میرے خلاف ہو گئے ہیں۔"

"میں منظور کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں"___ میں نے کہا___ "کیا اُس کو کسی چڑیل نے مارا ہے؟"

"اُس کو شاہ نے مروایا ہے"___ امام نے کہا۔

"یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟"

"یہ میں اس طرح کہہ سکتا ہوں کہ منظور کو میری باتوں کی سمجھ آگئی تھی"___ امام نے کہا___ "گاؤں میں دو اور آدمی ہیں جو مجھ سے متاثر ہو کر اس شاہ کی مریدی سے نکل آئے ہیں۔"

"آپ کے ساتھ منظور کا تعلق کیسا تھا؟"

"چونکہ یہ کم عقل دیہاتی پیری مریدی کے رنگ میں ہی سوچتے ہیں اس وجہ سے وہ مجھ کو اپنا پیر مانتا تھا" ــــ امام نے کہا ــــ "وہ میرے پاس بیٹھا کرتا تھا اور مجھ سے دین کی باتیں پوچھتا اور عمل کی کوشش کرتا رہتا تھا۔"

"پھر یہ شاہ تو آپ کا دشمن ہو گیا ہو گا" ــــ میں نے کہا۔

"جناب خان صاحب!" ــــ امام ہنس پڑا اور کہنے لگا ــــ "اگر میں اس کے آگے دب جاتا تو اب تک شاہ مجھ کو گاؤں سے ہی نہیں اس دنیا سے اٹھوا چکا ہوتا۔ اس نے مجھ کو دھمکیاں بھیجی تھیں کہ میں اس کے معاملے میں زبان بند رکھوں ورنہ میرے پیچھے مجھ کو ڈھونڈتے رہیں گے۔ یہ دھمکی اس کے ایک آدمی کی زبانی آئی تھی۔ میں اس کے گھر چلا گیا اور اس کو بتایا کہ میں کون سے خاندان کا آدمی ہوں۔ پھر میں نے اس کو کہا کہ اس نے پھر کبھی مجھ کو اس طرح دھمکی دی تو پھر دنیا دیکھے گی کہ کس کے پیچھے اس کو ڈھونڈ رہے ہیں۔"

یہ تو آپ سب جانتے ہیں کہ دیہات کی مسجدوں کے امام کس قسم کے ہوتے ہیں۔ ان کی ڈیل ڈول، بولنے کا طریقہ اور لباس الگ قسم کا ہوتا ہے لیکن یہ امام عام قسم کا مولوی لگتا ہی نہیں تھا۔ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ اس آدمی کا پیشہ امامت ہے۔ مسجدوں کے اماموں کو میں معزز افراد سمجھتا ہوں لیکن یہ کچھ اور قسم کا معزز آدمی تھا۔ اس نے جب اپنے خاندان کا نام لیا تو میں بھی متاثر ہوا۔ میں کسی خاص وجہ سے اس خاندان کا نام نہیں بتاتا۔ اس خاندان کے دو آدمی پولیس کے دو بڑے اہم عہدوں پر تھے۔

اس شخص کو مولوی یا امام نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن اللہ تعالیٰ اس کو مذہب کے راستے پر لے آیا۔ میرے پوچھنے پر اس نے مجھ کو بتایا تھا کہ اس کے خاندان اور برادری نے اس کو پاگل قرار دے دیا تھا۔ اس کا پاگل پن یہ تھا کہ اتنے اونچے جاگیردار خاندان کا بیٹا ہو کر وہ مذہب کی اور مسجدوں کی امامت کی باتیں کرتا تھا۔ اس کا خاندان انگریزوں کا پٹھو تھا اور اسی وجہ سے جاگیردار تھا لیکن اس آدمی کے دماغ میں اور دل میں خدا کا نور داخل

ہوگیا۔ اس نے کسی بھی عالم دین کی شاگردی نہیں کی تھی۔ کتابیں پڑھ پڑھ کر اور مختلف علماء سے پوچھ پوچھ کر اُس نے علم حاصل کیا تھا۔

اُس کا اصول یہ تھا جو دراصل صحیح اسلام ہے کہ فرقہ بندی اور پیر پرستی حرام ہے۔ مسلمان صرف مسلمان ہے۔ اس پر کوئی اور لیبل نہیں لگ سکتا۔ اُس نے انہی نظریات کو پھیلانا اپنا مشن بنا لیا تھا۔ اپنے گھر سے وہ بہت دُور آ گیا تھا۔ اُس کو یہ مسجد خالی مل گئی تو گاؤں والوں کے ساتھ بات کر کے اس مسجد کی امامت سنبھال لی۔ اُس نے پیر پرستی اور مزاروں پر سجدے کرنے کے خلاف وعظ کرنے شروع کر دیئے۔

دیہات میں اس قسم کے وعظ کرنے والے کو لوگ وہابی کہتے ہیں اور اس کو جس طرح اپنے خاندان والوں نے پاگل کہا تھا اسی طرح سب اس کو پاگل سمجھتے ہیں۔ ایسے آدمی قتل ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ قابل قدر آدمی شاہ جی کو اپنا خاندان نہ بتاتا تو وہ ایک دن بھی اس گاؤں میں نہیں ٹھہر سکتا تھا جو شاہ جی کا مرید تھا۔ یہ امام جو باتیں کرتا تھا وہ بہت تھوڑے لوگ قبول کرتے ہیں جو روشن خیال ہوتے ہیں یا جو اسلام کی صحیح روح کو سمجھتے ہیں۔

"منظور حسین کی بابت شاید آپ زیادہ جانتے ہوں گے"۔۔۔ میں نے کہا۔

"جی ہاں"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "خدا تعالیٰ کے بعد منظور حسین کو صرف میں جانتا ہوں۔ وہ کوئی عالم فاضل نہیں تھا۔ اَن پڑھ آدمی تھا۔ میں اُس کو اس واسطے زیادہ پسند کرتا تھا کہ میری باتیں سمجھتا تھا اور میرا ساتھ دیتا تھا۔ اُس نے میری بہت خدمت کی ہے۔"

"کیا اُس کو معلوم تھا کہ شاہ جی نے آپ کو دھمکی دی تھی؟"

"میں نے اُس کو بتایا تھا"۔۔۔ امام نے جواب دیا۔۔۔ "وہ غصے سے کانپنے لگا تھا کہ آپ اجازت دیں تو میں اس شاہ کو ختم کر دوں۔۔۔ میں نے اُس کو روک دیا تھا، لیکن ایک روز اُس نے مجھ کو بتایا کہ شاہ کے ساتھ اُس کا آمنا سامنا اتفاقیہ ہو گیا۔ اُس نے شاہ کو بڑی سخت باتیں کہیں اور شاہ نے اُس کو گالیاں دیں۔ شاہ نے اُس کو یہ بھی کہا تھا کہ تم اپنی موت کو پکار رہے ہو۔ منظور نے شاہ کی اس للکار کا جواب

للکارسے دیا تھا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"شاید بیس یا بائیس روز پہلے کی!"—— امام نے جواب دیا۔

"میں نے سُنا ہے وہ مرنے سے کچھ دن پہلے شاہ کے ہاں گیا تھا۔"

—— میں نے کہا —— "وہ تعویذ لینے پانچ چھ بار گیا تھا۔"

"میں نہیں مانتا!"—— امام نے کہا —— "اگر منظور میرے آگے جھوٹ بولتا رہا ہے تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا .... لیکن مجھ کو اُس پر اعتبار تھا۔ وہ شاہ کے گھر نہیں جاتا تھا۔"

"کیا اُس نے کبھی آپ کے ساتھ ایسی بات کی تھی کہ ایک چڑیل اس کے ساتھ پیار محبت کرنے کے واسطے اُس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے؟"— میں نے پوچھا۔

"کبھی نہیں"—— امام نے جواب دیا —— "اگر وہ ایسی مصیبت میں پھنس گیا ہوتا تو میرے ساتھ ضرور بات کرتا اور میں اُس کو سمجھاتا کہ یہ اُس کا وہم ہے۔"

"ہوسکتا ہے اُس نے اپنا یہ روگ آپ سے چھپا کر رکھا ہو۔"

"میں یہ بھی نہیں مانتا"—— اُس نے کہا —— "وہ مجھ سے کچھ نہیں چھپاتا تھا۔ مثال کے طور پر آپ کو اُس کی اور شاہ جی کی دشمنی کی ایک اور وجہ بتاتا ہوں۔ منظور نے یہ بات بھی مجھ سے نہیں چھپائی تھی۔ شاہ کی ایک جوان بیٹی ہے جو ابھی غیر شادی شدہ ہے۔ منظور کے پیچھے کوئی چڑیل تو نہیں پڑی ہوئی تھی البتہ یہ لڑکی اُس کے پیچھے چڑیلوں کی طرح پڑ گئی تھی۔ منظور کو وہ کھیتوں میں کہیں اکیلا دیکھ لیتی تو اُس کے پاس پہنچ جاتی تھی۔ یہ لڑکی عام طور پر اپنی حویلی کی چھت پر کھڑی رہتی اور جونہی اُس کو منظور نظر آتا وہ اُس کے پاس پہنچ جاتی۔ وہ منظور کی سُریلی آواز پر اور اُس کے کمائے ہوئے جسم کی خوبصورتی پر جان چھڑکتی تھی۔ منظور اُس سے جان چھڑاتا تھا۔ تین بار ایسا ہُوا کہ شاہ نے اُن دونوں کو اونچی فصل کے درمیان مینڈھ پر اکٹھے کھڑے دیکھا ....

"شاہ یہی سمجھ سکتا تھا کہ ان دونوں کے آپس میں قابلِ اعتراض تعلقات ہیں.... اُس نے منظور کو بہت ڈرایا اور دھمکایا۔ منظور نے اس کو کہا کہ اپنی لڑکی کو گھر میں بند کر کے رکھے ۔ لڑکی پھر بھی باز نہ آئی۔ وہ منظور کو ملی اور اُس کو بتایا کہ شاہ نے اُس کو بہت مارا پیٹا ہے۔"

امام کی یہ باتیں سُن کر مجھ کو بہت خوشی ہوئی۔ اُس نے قاتل کی نشاندہی کر دی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ منظور اور شاہ کی بیٹی کی آخری ملاقات کب ہوئی تھی۔

"میں یہ بھی بتا سکتا ہوں" ___ امام نے کہا ___ "مرنے سے تین روز پہلے مغرب کی نماز کے بعد منظور نے مجھ کو بتایا کہ آج پھر لڑکی اُس کے راستے میں آگئی اور شاہ نے اپنی حویلی کی چھت سے دیکھ لیا۔ وہ دوڑتا آیا۔ لڑکی گھر کو جا رہی تھی۔ لڑکی کو وہیں چھوڑ کر وہ منظور کے پاس آیا اور اُس کو کہنے لگا کہ تم نے مجھ کو کہا تھا کہ اپنی بیٹی کو گھر میں بند رکھو، اب میں تم کو خبردار کرتا ہوں کہ زندہ رہنا چاہتے ہو تو اپنے گھر میں بند ہو کر رہو۔ منظور نے اُس کو کہا کہ تمہاری بیٹی غلط نیت سے میرے پاس آتی ہے اور میں اُس کو ٹالتا رہتا ہوں۔ اُس نے شاہ کو یہاں تک کہہ دیا کہ اب وہ میرے پاس آئی تو پھر پاک صاف واپس نہیں جائے گی....

"منظور ایسا ناپاک آدمی نہیں تھا۔ اُس نے شاہ کی دھمکی کا جواب دیا تھا اور آپ جانتے ہی ہیں کہ جو کچھ اُس نے کہا تھا وہ بڑی گندی گالی ہے۔ مجھ کو جب اطلاع ملی کہ منظور کو چڑیل مار گئی ہے تو میں نے اپنے آپ سے کہا کہ میں اس چڑیل کو جانتا ہوں.... شاہ صاحب کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟"

"محترم!" ___ میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا ___ "آپ کے اصولوں اور نظریے کو دیکھ کر میں آپ کا بہت احترام کرتا ہوں۔ مجھ کو اُمید تو یہ رکھنی چاہیئے کہ آپ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں پھر بھی سوچ لیں کہ میں سب انسپکٹر ہوں اور تفتیش کر رہا ہوں۔ تفتیش میں بال کی کھال اُتاری جاتی ہے۔ گستاخی معاف کر دینا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ

دل میں شاہ کی دشمنی رکھ کر مجھ کو یہ بیان دے رہے ہیں؟"

"جو کہا ہے سچ ہے" ـــــ امام نے کہا اور انگلی اوپر کر کے بولا ـــــ "اللہ کی ذات کے سوا میرا کوئی گواہ نہیں۔ سچ اور جھوٹ کو جاننے والا وہی ہے۔ بات جو تھانے میں کہہ رہا ہوں وہی مسجد میں کہوں گا اور آپ عدالت میں لے جائیں گے تو بھی یہی بات میرے منہ سے نکلے گی۔ میرے پاس یہی ایک ذریعہ ہے کہ اللہ کو حاظر ناظر جان کر حلفیہ بیان تحریری دے دوں گا۔"

اس امام نے تو میرا مسئلہ ہی حل کر دیا تھا لیکن یہ صرف نشاندہی تھی۔ مقدمے میں صرف بیان کافی نہیں ہوتا، اس کے ساتھ شہادت کی بھی ضرورت ہوتی ہے یا ایک ہی قسم کا بیان ایک سے زیادہ گواہ دیں تو اسے سچ سمجھا جاتا ہے۔ میں نے عدالت کی نظر سے امام سے چند اور ضروری باتیں معلوم کیں اور اس کو گواہی کے لیے بھی تیار کیا۔ اگر میں جلد بازی سے کام لیتا تو میں فوراً شاہ کو تھانے میں طلب کر لیتا لیکن میں نے اس کے خلاف مزید شہادت کی فراہمی کے واسطے اور شاہ کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکالنے کے ارادے سے ایک اور راستہ اختیار کیا۔ وہ یہ تھا کہ میں نے کسی کانسٹیبل کو بھیجنے کی بجائے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو کہا کہ وہ شاہ کی بیٹی کو تھانے لے آئے۔ امام سے مجھ کو اس لڑکی کا نام بھی معلوم ہو گیا تھا۔

مجھ کو معلوم تھا کہ شاہ ہیڈ کانسٹیبل کو بہلائے پھسلائے گا، اس کو رشوت پیش کرے گا اور اس کے منہ میں یہ الفاظ ڈالے گا کہ شاہ کی بیٹی گھر میں نہیں ہے یا وہ لڑکی کے ساتھ خود آئے گا اور مجھ سے باز پرس کرے گا کہ میں نے اس کے گھر کے پردے کا بھی خیال نہیں کیا۔ میں نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا کہ شاہ نے ایسی کوئی رکاوٹ ڈالی تو میں اس کے ساتھ کیا سلوک کروں گا۔

اس شاہ کی بابت میں آپ کو تھوڑی سی واقفیت کرا دوں۔ یہ اپنے علاقے کی مشہور گدی تھی۔ جب تک اس شاہ کا باپ زندہ رہا اس گدی کی مریدی سارے علاقے میں پھیلی رہی۔ وہ مر گیا تو اس کے تین بیٹے پیچھے

رہ گئے۔ انہوں نے گدی کی قدر و منزلت قائم رکھنے کی بجائے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ زمین اور جائیداد وغیرہ پر آپس میں لڑائی جھگڑا کیا اور معاملہ کچہری تک گیا۔ پانچ چھ سال ان میں مقدمہ بازی اور ہاتھا پائی ہوتی رہی۔ ان پانچ چھ سالوں میں گدی کی شہرت گھٹتے گھٹتے معمولی سی ایک خانقاہ جتنی رہ گئی۔ آخر ان کے درمیان فیصلہ ہوا۔ دوسرے بھائی جائیداد لے گئے۔ یہ شاہ عقل مند اور چالاک تھا۔ اس نے سوچا پیری قائم رہی تو جائیداد بنتے دیر نہیں لگے گی۔ اُس نے باپ کی گدی اور ایک حویلی پہ قناعت کر لی، لیکن اس گدی کی شہرت ختم ہو چکی تھی۔ اس شاہ نے مریدی میں کچھ اضافہ کیا لیکن اس کیس نے اس کو مزید نقصان پہنچایا۔ اس کے چند سال بعد جب پاکستان بن گیا اور مہاجرین آ گئے تو اس گدی کو سہارا مل گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ گدی شاہ کے باپ کے زمانے جیسی شہرت ایک بار پھر حاصل کر گئی۔

میں نے امام کو یہ کہہ کر جانے کی اجازت دے دی کہ وہ گاؤں میں موجود رہے اور طلبی پر فوراً پہنچے۔ میں نے اُس کو یہ بھی کہا کہ وہ ہوشیار ہو کر رہے ورنہ گاؤں والوں کے ہاتھوں بہت خراب ہو گا۔

منظور کے دو دوست آئے ہوئے تھے۔ میں نے ایک کو بلایا اور اس سے یہ سوال پوچھے ——— "منظور کا چال چلن کیسا تھا؟"

"کیا اس نے تمہیں بتایا تھا کہ اس کے پیچھے ایک چڑیل پڑی ہوئی تھی؟"

"شاہ کی بیٹی کے ساتھ اُس کا کیا معاملہ تھا؟"

"کیا مرنے سے پہلے منظور شاہ کے پاس تعویذ لینے جاتا رہا تھا؟"

"شاہ کے ساتھ اس کی کیا دشمنی تھی؟"

منظور کے اس دوست نے ان سوالوں کے وہی جواب دیئے جو امام مجھ کو تفصیل سے بتا چکا تھا۔ اُس کے دوسرے دوست کو بلایا تو اُس نے بھی بالکل وہی جواب دیئے جو مجھ کو پہلے مل چکے تھے۔ ان دونوں سے مجھ کو یہ بھی پتہ لگا کہ نمبردار کے ساتھ بھی منظور کی بول چال بند تھی۔ ان دونوں نے بتایا کہ نمبردار منظور سے کچھ ڈرتا بھی تھا۔ ان

دونوں آدمیوں کی بابت جو نمبردار کے ساتھ آئے تھے، منظور کے ان دونوں دوستوں نے بتایا کہ نمبردار کے خاص آدمی ہیں۔ پیتے پلاتے بھی ہیں اور نمبردار کے خوشامدی بھی بنے ہوئے ہیں۔ مختصر یہ کہ امام کے بیان کی اور منظور کی بیوی کے بیان کی بڑی اچھی تصدیق ہو گئی۔

میرے واسطے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ میں نمبردار کو اور اس کے دونوں آدمیوں کو ابھی لپیٹ میں لے لوں یا پہلے شہادت اکٹھی کر لوں۔ نمبردار کو اور اس کے آدمیوں کو بھی شک ہو گیا تھا کہ میں نے اُن کا جھوٹ پکڑ لیا ہے۔ میں نے سوچا کہ ان کو اپنے اندر اندر پریشان ہونے دوں اور تھانے میں ہی بٹھائے رکھوں۔

میں نے زرگل کو اپنے پاس بلایا اور اس کو بتایا کہ بہت ساری نشاندہی ہو گئی ہے اور مجھ کو اُمید ہے کہ لڑکا بھی مل جائے گا۔ زرگل نے مجھ سے اس تفتیش کی تفصیل پوچھی جو میں کر چکا تھا۔ میں نے جب اس کو تفصیل سنائی تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"پھر اُن کو مہمان بنا کر کیوں بٹھایا ہوا ہے؟" ــــ اس نے بڑے سخت غصے میں کہا ــــ "میں اس نمبردار کو اور اس کے دونوں ساتھیوں کو ابھی اُلٹا لٹکاتا ہوں۔ نیچے انگارے رکھ کر اُن پر سرخ مرچ ڈالوں گا اور کہوں گا کہ جب تک میرے بچے کی نشاندہی نہیں کرو گے اسی طرح لٹکے رہو گے۔"

یہ کہہ کر وہ باہر کی طرف چل پڑا۔ میں نے دوڑ کر اس کو پکڑ لیا۔

"ابھی نہیں زرگل!" ــــ میں نے اس کو پیچھے گھسیٹتے ہوئے کہا ــــ "میری محنت پر پانی پھر جائے گا۔ تم جو کرنا چاہتے ہو وہ میں بعد میں کر دوں گا۔"

"تم پنجابی کم عقل ہوتے ہو" ــــ اس نے کہا ــــ "یہ ان کے باپ کی بیٹھک نہیں ہے۔ یہ اگر مشتبہ ہیں تو ان کا سر نیچے اور ٹانگیں اوپر ہونی چاہئیں۔ میں ان کو نہیں چھوڑوں گا۔"

"اوئے زرگل! عقل سے کام لے" ــــ میں نے اسے زبردستی گھسیٹ کر کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا ــــ "میری تفتیش کو چوپٹ نہ کر دینا۔ ذرا صبر کرو۔ دُعا کرو تمہارا بچہ تم کو زندہ مل جائے۔"

بڑی مشکل سے زرگل کو قابو میں کیا۔

"محبوب خاناں!" ۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "میرا بچہ مجھ کو نہ ملا تو میں تم کو گولی مار دوں گا۔"

تین ساڑھے تین گھنٹے بعد شاہ آگیا۔ اُس کے ساتھ ایک عورت تھی جو پرانے ٹائپ کے برقعے میں تھی۔ میں پہلی بار شاہ کو دیکھ رہا تھا۔ شاہ کی عمر یقیناً چالیس سال سے اوپر تھی لیکن رنگ ایسا لال کہ وہ پچیس چھبیس سال کی عمر کا پہلوان لگتا تھا۔ اُس نے لڑکی کو برآمدے میں بنچ پر بٹھا دیا اور میرے پاس آیا۔ زرگل میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ شاہ اپنے آپ ہی آ کر ہمارے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ بڑے غصے میں ہے۔

"آپ نئے تھانیدار ہیں جناب؟" ۔۔۔ شاہ جی نے بڑے بالائی افسر کے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

"جی شاہ جی!" ۔۔۔ میں نے ایک ادنیٰ ملازم کی طرح جواب دیا ۔۔۔ "میں ہی ہوں۔"

"زرگل صاحب نے آپ کو ہماری بابت شاید کچھ نہیں بتایا" ۔۔۔ شاہ جی نے کہا ۔۔۔ "ہماری گدی اور آستانے کی یہ توہین انگریز افسروں نے بھی کبھی نہیں کی تھی۔ آپ ہندوستانی افسر ہیں اور آپ مسلمان بھی ہیں۔ آپ نے یہ جرأت کیوں کی؟ ہماری بیٹی کو آپ نے تھانے بلایا ہے؟"

"میں مجبور ہوں شاہ جی!" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "ڈیوٹی کی مجبوری ہے۔ اگر ہم کوتاہی کریں تو جن انگریز افسروں نے آپ کے آستانے کی کبھی توہین نہیں کی وہ ہماری اتنی توہین کرتے ہیں جو ہم برداشت نہیں کر سکتے۔"

"ہمیں آپ کی توہین کی کوئی پرواہ نہیں" ۔۔۔ شاہ جی نے پرانے زمانے کے بادشاہوں کی طرح کہا ۔۔۔ "آپ نے جس گدی کی توہین کی ہے وہ آپ کو معاف نہیں کرے گی۔ اللہ کے ان پیارے بزرگوں کی روحیں جو مزار شریف میں دفن ہیں آپ کو چین سے جینے نہیں دیں گی۔ آپ نے اتنا بھی نہ سوچا کہ ہماری بیٹی پردہ نشین ہے اور اس کو ہم برقعے میں لائے ہیں۔ تھانیداری پر اتنا غرور نہ کرو۔"

"شاہ جی حضور!" ــــ میں نے پوچھا ــــ "گستاخی معاف۔ کیا آپ کی بیٹی کھیتوں میں منظور کو اکیلا دیکھ کر اُس کے پاس برقعے میں جایا کرتی تھی؟"

شاہ جی کے ہونٹ کانپنے لگے اور وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں اندازہ نہیں کر سکا کہ اُس کو غصہ آ گیا تھا یا وہ گھبرا گیا تھا۔

"ہمارا وقت مت ضائع کرو شاہ جی!" ــــ زرگل نے کہا ــــ "ہم نے آپ کی بیٹی کو تفتیش کے واسطے بلایا ہے۔"

"کیسی تفتیش خان صاحب؟" ــــ شاہ جی نے کہا ــــ "ہماری بیٹی نے کیا جُرم کیا ہے؟"

"شاہ جی!" ــــ میں نے کہا ــــ "آپ باہر تشریف لے جائیں اور ہمیں گستاخی کا موقع نہ دیں۔ یہ تھانہ ہے۔ ہم نے آپ کی بیٹی سے کچھ پوچھنا ہے اور ہم اپنا یہ کام ضرور کریں گے۔ اگر آپ فوراً باہر نہیں نکل جائیں گے تو ہم آپ کو گھسیٹ کر باہر نکال دیں گے۔ اگر آپ نے ہم کو پریشان کیا تو ہم آپ کو حوالات میں بند کر دیں گے۔"

یہ تو ہم جانتے تھے کہ شاہ کی اصلیت کیا ہے۔ اُس نے کچھ کہنا چاہا تو زرگل اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ایک منٹ میں باہر نکل جاؤ" ــــ زرگل نے بڑے غصے میں کہا۔

شاہ نے عجیب تماشا دکھایا۔ وہ بڑے زور سے اُٹھا اور باہر نکل گیا۔

"تمہارا یہ تھانہ تباہ ہو گا" ــــ باہر سے شاہ کی بڑی بلند للکار سنائی دی ــــ "چڑیلیں تمہارے بچوں کو غائب کر دیں گی۔ پھر بلا ما اپنے انگریز حاکموں کو" ایسے منظر دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

وہ واہی تباہی بک کر خاموش ہو گیا۔ میں اور زرگل اندر بیٹھے سنتے رہے۔ اُس کی آواز خاموش ہو گئی تو میں نے زرگل کو کہا کہ وہ مجھ کو اکیلا چھوڑ دے۔ ایک کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ وہ شاہ کی بیٹی کو میرے پاس لے آئے۔

وہ دلکش چہرے اور چھریرے بدن والی نوجوان لڑکی تھی۔ اُس کے چہرے پر اُداسی تھی۔ اُس نے اندر آتے ہی برقعے کا نقاب اُٹھا دیا تھا۔

"گھبرانا نہیں!" ــــ مَیں نے کہا ــــ "یہ بتاؤ کہ تم جب بھی باہر نکلتی ہو تو برقع اوڑھ کر نکلتی ہو؟"

"نہیں" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "شاہ جی نے کہا تھا کہ برقعے میں چلو۔ میرا برقع تو ہے ہی نہیں۔ یہ میری ماں کا برقع ہے"

"تمہارے والد صاحب ناراض ہو رہے تھے..."

"یہ میرے والد صاحب نہیں" ــــ لڑکی نے میری بات کاٹ کر کہا ــــ "اسی واسطے میں ان کو شاہ جی کہا کرتی ہوں"

"یہ کیا معاملہ ہُوا؟" ــــ مَیں نے پوچھا۔

"انہوں نے میری ماں کے ساتھ شادی کی تھی" ــــ اُس نے کہا ــــ "مَیں اُس وقت تین سال سے ذرا زیادہ عمر کی تھی جب میری ماں بیوہ ہو گئی تھی۔ مَیں اُس کی ایک ہی اولاد تھی۔ میری ماں خوبصورت تھی اور اُس کے نام پر کچھ زمین بھی تھی۔ اس شاہ کی پہلے بھی ایک بیوی تھی۔ شاہ نے دو آدمیوں کو ساتھ ملا کر دھوکے میں میری ماں کے ساتھ شادی کر لی"

اس لڑکی کا بیان لمبا تھا۔ مَیں اُس سے اُس کی ماں کی ہسٹری نہیں سُننا چاہتا تھا لیکن لڑکی نے اس طرح بولنا شروع کر دیا تھا جیسے وہ اپنے دل کا غبار نکال رہی ہو۔ مختصر بات یہ تھی کہ شاہ بدکار آدمی تھا۔ شراب پیتا تھا اور رات کو اُس کے پاس نئی سے نئی عورت آتی تھی۔ لڑکی کی ماں کا یہ سلسلہ پسند نہیں تھا۔ اُس نے اعتراض کیا تو شاہ نے اُس کو مارا پیٹا پھر یہ چوتھے پانچویں دن کا دستور ہو گیا کہ شاہ لڑکی کی ماں کو زدوکوب کرتا تھا۔

لڑکی بڑی ہوئی تو شاہ نے اس کے ساتھ بھی اُس کی ماں جیسا سلوک شروع کر دیا۔ لڑکی بہت تلخ حالات میں پل کر جوان ہوئی۔ اُس کی ماں وقت سے پہلے بوڑھی ہو گئی۔ لڑکی کو منظور بہت اچھا لگا اور وہ اُسے کے پیچھے پھرنے لگی لیکن منظور اُس کو قبول نہیں کرتا تھا۔ لڑکی نے

مایوس ہو کر منظور کو کہا کہ وہ اُس کے ساتھ پیار محبّت کی ایک دو باتیں کر دیا کرے۔ منظور نے اُس کی یہ بات مان لی لیکن اُس کو زیادہ وقت اپنے پاس نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔

شاہ نے دیکھ لیا۔ لڑکی کے ساتھ شاہ پہلے ہی اچھا سلوک نہیں کرتا تھا۔ اب اُس کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ لڑکی پھر بھی باز نہ آئی۔

"کیا منظور شاہ کے ہاں نہیں جاتا تھا؟" ـــــ میں نے پوچھا۔

"نہیں" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "وہ کبھی نہیں آیا تھا۔"

میں لڑکی سے سوال جواب کے ذریعے کوئی سُراغ لینا چاہتا تھا جس میں مجھ کو مایوسی ہوئی۔ لڑکی کے دل میں شاہ کے خلاف بہت نفرت تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ اس کوشش میں ہے کہ شاہ کو گرفتار کرا دے۔ اُس کو تو جیسے معلوم ہی نہیں تھا کہ میں کس سلسلے میں اُس سے پوچھ گچھ کر رہا ہوں۔ مجھ کو یہ شک بھی ہوا کہ اس کو شاید یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ کہاں بیٹھی ہوئی ہے اور کس کے ساتھ بات کر رہی ہے۔

مجھ کو یہ سمجھنے میں تھوڑا اور وقت لگ گیا کہ یہ لڑکی ذہنی لحاظ سے نارمل نہیں۔ میں اس کی وجہ آپ کو پہلے ہی بتا دیتا ہوں کہ وہ نارمل کیوں نہیں تھی۔ تین چار سال کی عمر کی تھی تو اُس کا باپ مر گیا۔ لڑکیاں باپوں کو زیادہ چاہتی ہیں۔ اس لڑکی کو ایک تو صدمہ یہ پہنچا اور دوسرا صدمہ یہ کہ اُس کو اپنے پیارے باپ کی جگہ ایک ظالم باپ مل گیا جو اُس کو بھی مارتا تھا اور اُس کی ماں کو بھی۔ پیار اور شفقت کی جگہ اُس کو ظلم اور تشدد ملا۔ پھر اُس نے اس گھر میں شراب نوشی اور بدکاری دیکھی جو اس جگہ کا یعنی شاہ کی حویلی کا دستور تھا۔

آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ ان حالات میں پلے ہوئے بچے شفقت اور پیار سے محروم ہوتے ہیں اور ان کو جس سے بھی پیار مل جائے خواہ وہ جھوٹا ہی ہو، وہ اُسی کے ہو کے رہ جاتے ہیں۔ اس لڑکی کو منظور اچھا لگا تو اُس نے اُسی کو پیار کا بُت بنا لیا۔ میں نے اُس سے پوچھا تھا کہ منظور اُس کو کیوں اچھا لگتا تھا۔

"وہ جب رات کو ہیر گایا کرتا تھا تو اُس کی آواز میرے گھر تک پہنچا کرتی تھی" ـــــ اُس نے کہا تھا ـــــ "میرا دل اس طرح بے قابو ہوتا تھا جیسے منظور مجھ کو بلا رہا ہے۔"

اس جذباتی حالت میں وہ تڑپتی اور روتی تھی۔ اُس نے مجھ کو آگے جو بیان دیا وہ مختصر طور پر اس طرح تھا کہ آخر شاہ نے اُس کو گھر میں بند کر لیا۔ کچھ اور سوال جواب کے بعد اس لڑکی نے ایک اور بات بتا دی۔ وہ یہ تھی کہ کچھ دنوں سے وہ کسی بچے یا کسی عورت کے رونے کی آواز سنتی تھی جو کسی کمرے میں سے آتی تھی۔ گھر میں کوئی بچہ نہیں تھا۔ اُس کی ماں بھی اُس کے سامنے موجود ہوتی تھی۔ یہ آواز شاہ کی دوسری بیوی کی ہو سکتی تھی۔

ایک رات اس کی ماں سو گئی تھی اور وہ جاگ رہی تھی۔ اُس کو پھر رونے کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ اپنے کمرے سے نکل گئی اور برآمدے میں سے ہوتی ہوئی ایک کمرے کے پاس جا کر رُکی۔ آواز اسی کمرے میں تھی۔ وہ کمرے کے پہلو میں گئی۔ وہاں کھڑکی تھی جو ذرا سی کھلی ہوئی تھی۔ اُس نے دیکھا کہ گیارہ بارہ سال کا ایک بچہ رو رہا ہے اور ایک آدمی اُس کو ڈرا رہا ہے۔ کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔

"بچہ کچھ کہتا بھی تھا؟" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ "یا صرف روتا تھا؟"

"وہ کچھ کہتا بھی تھا" ـــــ لڑکی نے جواب دیا ـــــ "معلوم نہیں وہ اُردو بولتا تھا یا کیا زبان بولتا تھا۔"

"ہماری طرح پنجابی زبان نہیں بولتا تھا؟"

"نہیں" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "وہ بڑا خوبصورت لڑکا ہے رنگ اُس کا گورا ہے۔"

میں نے اور کچھ نہ سُنا۔ میں سپرنگ کی طرح اُچھلا اور باہر نکل کر زرگل کو آواز دی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور اُس کو کہا کہ شاہ کو فوراً لے آؤ۔ میں شاہ کو کسی پوچھ گچھ کے بغیر حوالات میں بند کرنا چاہتا تھا۔ اب کسی شک کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ ہمارا ملزم شاہ تھا۔

"جناب وہ تو چلے گئے ہیں" —— ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

"کہاں چلا گیا ہے؟"

"اس عورت کو آپ کے حوالے کرکے شاہ جی بڑے غصّے میں بولتے رہے تھے" —— ہیڈ کانسٹیبل نے کہا —— "پھر وہ باہر نکل گئے، وہ گھوڑی پر آئے تھے۔ عورت دوسرے گھوڑے پر سوار تھی۔ شاہ جی اپنی گھوڑی پر سوار ہوئے اور چلے گئے۔"

"زر گلا!" —— جونہی زر گل میرے پاس آیا میں نے بہت تیز تیز بولتے ہوئے کہا —— "تمہارا بچّہ مل گیا ہے۔ فوراً چھاپے کا بندوبست کرو۔ ایک منٹ نہ لگاؤ۔"

گاؤں تین میل سے ذرا دُور تھا۔ ہم گھوڑوں اور ایک تانگے کے ذریعے وقت ضائع کیے بغیر پہنچے پھر بھی ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ شاہ کے گھر اس طرح داخل ہوئے جیسے یہ چوروں کا اڈہ ہو۔ سیدھے اندر گئے۔ شاہ نے واہی تباہی بکنی شروع کر دی۔ میں اُس کو احترام سے باہر لا کر کانسٹیبلوں کے حوالے کرنا چاہتا تھا، لیکن زر گل کا دماغ اتنا خراب ہو گیا تھا کہ اُس نے شاہ کو گریبان سے پکڑا اور آگے گھسیٹ کر اُس کی گردن پر مُکّا مارا اور اس طرح اُس کی تھوڑی سی مرمّت کرکے پوچھا کہ لڑکا کہاں ہے۔

"کون سا لڑکا؟" —— شاہ نے پوچھا —— "یہاں کوئی لڑکا نہیں۔ تلاشی لے لو۔۔۔۔ تم پر اس گدی کی ایسی لعنت پڑے گی۔۔۔۔"

زر گل کے ایک زوردار تھپڑ نے شاہ کو آگے بولنے نہ دیا۔ دونوں ہیڈ کانسٹیبلوں نے تلاشی اور چھاپے کے دستور کے مطابق اس حویلی میں جتنے افراد تھے اُن سب کو ایک جگہ اکٹھا کر لیا تھا۔ دو عورتیں تھیں اور دو آدمی۔ یہ آدمی ملازم ٹائپ لگتے تھے۔ میں نے ان دونوں آدمیوں کو الگ کر لیا اور ان کو کہا کہ وہ بتا دیں کہ بچّہ کہاں ہے ورنہ اُن کی ہڈیاں یہاں ٹوٹیں گی پھر تھانے میں مرمّت ہو گی۔ اس کے بعد دس دس سال سزا ملے گی۔

دونوں نے انکار کیا۔

مکان کی تلاشی لی گئی۔ میں نے اس مظلوم لڑکی سے اُس کمرے کا محلِ وقوع معلوم کر لیا تھا جس میں وہ کہتی تھی کہ بچہ دیکھا ہے۔ اُس کمرے میں بچہ نہیں تھا۔ بچہ کسی بھی کمرے میں نہیں تھا۔ میں نے شاہ کو ایک طرف کیا۔

"شاہ جی!" ۔۔۔ میں نے اُس کو کہا ۔۔۔ "کیوں اپنی بے عزتی کراتے ہو۔ انگریزوں کے قانون میں تمہاری گدی کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ گدی ختم ہو جائے گی۔"

"تم چاہتے کیا ہو؟" ۔۔۔ اُس نے بڑے غصے میں پوچھا ۔۔۔ "کیا ڈھونڈتے ہو میرے گھر میں؟"

"سب انسپکٹر زرگل کا بچہ" ۔۔۔ میں نے کہا۔

"یہاں کسی زرگل کا بچہ نہیں ہے" ۔۔۔ اُس نے مکمل ڈھیٹ پن سے جواب دیا ۔۔۔ "ملتا ہے تو ڈھونڈ لو۔"

"بہت اچھا شاہ جی!" ۔۔۔ میں نے کہا اور اُس کو کانسٹیبلوں کے حوالے کر کے کہا ۔۔۔ "ہتھکڑی لگا لو۔"

جس طرح اُس کو ہتھکڑی لگائی گئی وہ آپ یوں سمجھیں جیسے مست بھینسے کے گلے میں رسہ ڈالا جاتا ہے۔ میں نے اُن دو آدمیوں میں سے ایک کو گریبان سے پکڑا اور صحن میں لا کر اُس کے منہ پر ایک مکا مارا تو وہ پیچھے جا پڑا۔ زرگل دوڑا آیا۔ اُس نے اُس کی ایک ٹانگ ٹخنے سے پکڑ کر اُٹھا لی۔ دوسری ٹانگ میں نے پکڑ لی۔ وہ پیٹھ کے بل پڑا ہوا تھا۔ ہم نے اُس کی ٹانگیں اوپر کر کے اس طرح اپنی اپنی طرف کھینچیں جس طرح ریلوے سٹیشن پر کانٹے بدلنے والا کانٹا بدلتا ہے۔ وہ شخص چیخنے اور چلانے لگا۔ ہم اُس کی ٹانگیں اس طرح اِدھر اُدھر کھینچ رہے تھے جیسے اُس کو چیر کر اُس کے جسم کے دو حصے کر دیں گے۔ ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ دوسرے آدمی کی بھی ذرا خاطر کرو۔

اب دونوں آدمی اس قدر چیخ و پکار کر رہے تھے جس کو صرف پولیس کے آدمی برداشت کر سکتے ہیں۔ کوئی دوسرا آدمی صرف سن ہی لے

تو وہ ڈر کر اقبالِ جرم کر لے۔

ان میں سے ایک نے ہاتھ جوڑ دیے اور کہنے لگا کہ وہ بتلائے گا۔ اُس نے صاف الفاظ میں بتا دیا کہ لڑکا اس کمرے میں بند رہا ہے اور آج شاہ جب لڑکی کو تھانے چھوڑ کر آیا تو اُس نے لڑکے کو کمبل میں لپیٹ کر ان دونوں آدمیوں کو کہا کہ اس کو فلاں گاؤں میں چھوڑ آؤ۔ اُس نے گاؤں کی نشاندہی کی۔ یہ گاؤں کُل پانچ چھ گھروں کا ہی تھا جو ایک میل بھی دُور نہیں تھا۔ مَیں اور رزرگل اپنے دو تین کانسٹیبلوں کو لے کر اُس آدمی کے ساتھ اُس گاؤں گئے۔ ایک آدمی گاؤں کے باہر کھڑا تھا۔ اس نے ہم کو دُور سے دیکھا تو ایک طرف کو دوڑ پڑا۔ وہ گاؤں کے اندر نہ گیا بلکہ کسی دوسری طرف جا رہا تھا۔ اُس کے بھاگنے سے ہم بھی سمجھ سکتے تھے کہ یہ ملزم ہے ورنہ بھاگنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مَیں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور گھوڑا اُس کے پیچھے ڈال دیا۔ وہ پا پیادہ کتنا تیز دوڑ سکتا تھا۔ مَیں نے اُس کو زیادہ دُور نہ جانے دیا۔

مَیں نے جب گھوڑے سے اُتر کر اُس کو پکڑا تو وہ ہاتھ جوڑ کر منتیں کرنے لگا۔ اُس کا جسم خوف سے کانپ رہا تھا۔ مَیں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کیوں بھاگا ہے۔

"جناب، مَیں بے قصور ہوں" ـــــ اُس نے کانپتے ہُوئے کہا ـــــ "شاہ جی نے حکم دیا تھا کہ اس لڑکے کو دو دن اپنے گھر میں رکھو"

"لڑکا کہاں ہے؟"

"میرے گھر میں ہے جناب!" ـــــ اُس نے جواب دیا۔

مَیں جب اُس کو ساتھ لے کر اُس کے گھر پہنچا تو لڑکا رزرگل کے گلے لگا ہُوا تھا۔ اُس کو اُن لوگوں نے دیہاتی قسم کے کپڑے پہنائے ہُوئے تھے اُس کو اس حالت میں اغوا کیا گیا تھا کہ اُس کے کپڑے اُترے ہُوئے تھے۔ گاؤں کے دو آدمیوں کو بچے کی برآمدگی کا گواہ بنایا۔ بیان لکھ کر اُن کو پڑھ کر سُنائے اور اُن کے انگوٹھے لگوا لیے۔ پھر ان دو آدمیوں کو اور شاہ کو ساتھ لے کر ہم تھانے میں آ گئے۔ تھوڑی دیر بعد تھانے کے احاطے کے

باہر شاہ کے مریدوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ وہ خاموشی سے کھڑے تھے۔ اُن میں دنگا فساد کرنے یا احتجاجی مظاہرہ کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ ہم جانتے تھے کہ شاہ اقبالِ جرم کرے، لیکن وہ بڑی ڈھیٹ مٹی کا بنا ہوا تھا۔ میں ضروری نہیں سمجھتا تھا کہ وہ اقبالِ جرم کرے۔ مقدمے کی مضبوطی کے واسطے میرے پاس اور ذریعے موجود تھے لیکن زرگل اس قدر غصے میں تھا کہ اس کے بس میں ہوتا تو شاہ کی گردن پر چھری پھیر دیتا۔

"محبوب خاماں!"— اُس نے مجھ کو کہا — "تم اب باقی کام مجھ کو کرنے دو۔"

اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ شاہ کو ایک کمرے میں لے گیا اور ایذا رسانی کا عمل شروع کر دیا۔ میں متعلقہ آدمیوں سے جو اب ملزم تھے اقبالی بیان لے رہا تھا۔ ایک اور آدمی کی نشاندہی ہوئی جو تھانے والے گاؤں میں ہی رہتا تھا۔ میں نے اُس کی گرفتاری کے واسطے اے ایس آئی کو بھیج دیا۔

میں جب تقریباً دو گھنٹے بعد دیکھنے گیا کہ زرگل کیا کر رہا ہے تو شاہ کو بے ہوشی کی حالت میں پایا۔ زرگل نے اُس کو ایسی ایسی ایذا دی تھی جس کو شاہ جیسا مضبوط آدمی بھی زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکا۔ بچہ تو مل گیا تھا۔ ہم نے منظور کے قاتل کو بھی پکڑنا تھا۔ قاتل شاہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس نے قتل خود تو نہیں کیا ہو گا۔ اپنے کسی آدمی سے کروایا ہو گا۔

زرگل نے رات کو بھی شاہ کی ایذا رسانی جاری رکھی۔ وہ ہوش میں آتا تھا تو زرگل اپنا ظالمانہ عمل شروع کر دیتا تھا۔ اگلے دن دوپہر کے بعد شاہ نے نیم غشی کی حالت میں قتل کا اقبال کر لیا۔ اِسی حالت میں اُس نے بتایا کہ زرگل کے بیٹے کو اس نے اس مطلب سے اغوا کرایا تھا کہ اس کو ڈرائے گا کہ اس کے بچے کو چڑیل اٹھا کر لے گئی ہے اور وہ بچہ اس شرط پر واپس کرے گی کہ وہ تفتیش بند کر دے، لیکن اُس کی سکیم ناکام ہو گئی۔

میں نے اُن خطروں کی سوچ لی تھی جو عدالت میں پیش آیا کرتے ہیں میں نے شاہ کو دیکھ لیا تھا کہ یہ شخص بڑے مضبوط پتھر کا بنا ہوا ہے اور اگر

اس نے اقبالی بیان زیرِ دفعہ ۱۶۴ مجسٹریٹ کو بھی قلمبند کرا دیا تو بھی یہ شخص سیشن کورٹ میں جا کر منحرف ہو جائے گا۔ مَیں نے زرگل کو بہت مشکل سے سمجھایا کہ اب اس کو چھوڑ دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مر جائے یا اس کو ایسا نقصان پہنچ جائے جو عدالت میں ثابت ہو جائے کہ یہ ایذا رسانی کا نتیجہ ہے۔ مَیں نے زرگل کو بتایا کہ اُس نے اگر کسی سے قتل کروایا ہے تو بھی میں یہ ثابت کر دوں گا کہ قتل اس نے اپنے ہاتھ سے کیا ہے۔

"بس میں یہی چاہتا ہوں" ___ زرگل نے کہا ___ "مَیں اس شخص کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتا۔"

پانچ چھ گھنٹوں کے اندر اندر ساری واردات ہمارے سامنے آ گئی۔ جس نے منظور کا گلا دبایا تھا، اُس نے اقبال کر لیا تھا۔ مَیں نے اُس کو کہا کہ وہ بیان دے کہ گلا شاہ نے دبایا تھا اور اس شخص نے خود منظور کو پکڑ کر رکھا تھا۔ اس شخص کو مَیں نے یہ بیان دینے کے صلے میں یہ انعام دیا کہ اُس کو وعدہ معاف گواہ بنا لیا۔ دوسرے ملزموں کو یہ وعدے دیئے کہ اُن کو بری کرا دوں گا یا بہت تھوڑی سزا دلاؤں گا۔ شرط یہ ہے کہ وہ ہمارے بتائے ہوئے بیان دیں۔

ہم نے دیکھ لیا تھا کہ اتنے گھناؤنے اور سنگین جرم کرانے والا شاہ ہے۔ ہم اس کو معاف نہیں کر سکتے تھے۔ قانون کی پابندیاں تو کچھ اور کہتی تھیں لیکن میں ذاتی طور پر پسماندہ ذہن کے سیدھے سادے ان دیہاتی لوگوں کو بے گناہ سمجھتا تھا۔ اس قسم کے شاہ دیہاتیوں کو اپنے اثر میں لا کر بدکاری کرتے ہیں اور اُن کو آلۂ کار بناتے ہیں۔ یہ دو جرم جس وجہ سے کیے گئے تھے وہ میں نے بیان کر دی ہے۔ شاہ نے منظور کو ایک اس وجہ سے سزا دی تھی کہ وہ اس سے باغی ہو گیا تھا۔ دوسری وجہ یہ کہ اُس نے شاہ کی بے عزتی کی تھی اور تیسری وجہ یہ کہ اُس کو شک تھا کہ اُس نے اس کی لڑکی کے ساتھ ناجائز تعلق رکھا ہوا تھا۔

مَیں نے کہانی اس طرح شروع کی تھی کہ سلمان کا دماغ قدرتی طور پر

سائنس ہے اور ایجاد کی طرف جاتا ہے لیکن ہماری قوم کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کو شاہ جیسے پیروں کی لیڈری مل گئی جو ساری قوم کو بدی کی طرف لے گئی۔ غور کریں کہ قتل کا کیا طریقہ اختیار کیا گیا۔ چھوٹا سا ایک بکرا نمبردار کے گھر ذبح کیا گیا اور یہ بتایا گیا کہ نمبردار نے صدقہ دیا ہے۔ کلیجی گھر میں رکھی گئی جس کا ایک ٹکڑا منظور کو قتل کر کے اُس کے منہ میں ٹھونس دیا گیا۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ اُس زمانے میں دیہات میں بکرے کا گوشت نہیں ملتا تھا۔ اس وجہ سے ایک بکرا ذبح کیا گیا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ نمبردار بھی اس جرم میں شامل تھا۔ اس کے جن دو آدمیوں نے اُس کے بیان کی تصدیق کی تھی انہوں نے نمبردار اور شاہ کے بتائے ہوئے بیان بنائے میں دیے تھے۔

جُرم کی سزا سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ دنیا کا قانون سزا نہ دے تو خدا کا قانون کسی نہ کسی طرح پکڑ لیتا ہے۔ ان لوگوں سے غلطی یہ ہوئی کہ مجھ کو یہ بیان دیا کہ منظور شاہ کے پاس تعویذ لینے کے واسطے جایا کرتا تھا۔ انہوں نے یہ نہ سوچا کہ دوسری طرف یہ ثابت ہو جائے گا کہ شاہ اور منظور کی آپس میں دشمنی ہے۔ اسی جھوٹ پر مجھ کو صحیح راستہ ملا تھا۔

بچے کے اغوا کی وجہ بھی میں نے بیان کر دی ہے۔ ان لوگوں نے دیکھ لیا تھا کہ بچہ ندی میں نہانے کے واسطے جاتا رہتا ہے۔ شاہ کے کہنے پر

"آپ کے والد صاحب کی کوئی ذاتی دشمنی؟"

"میں اس کا جواب ہاں یا نہ میں نہیں دے سکتا" — اُس نے جواب دیا — "ہمارے والد صاحب رنگین مزاج آدمی تھے۔ آپ نے اُن کی بیوی دیکھ لی ہے۔ اس عمر میں آکر انہوں نے اتنی جوان لڑکی کے ساتھ بیاہ رچا لیا۔"

"اس کے علاوہ ان کی رنگینیاں کیا تھیں؟"

"کیا یہ بتانا ضروری ہے؟" — اُس نے پوچھا۔

"اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے والد صاحب قتل ہوئے ہیں تو آپ کو وہ سب کچھ بتانا پڑے گا جو آپ جانتے ہیں" — میں نے کہا — "اگر آپ اپنے والد صاحب کے قاتل کو پکڑوانا نہیں چاہتے تو کچھ بھی نہ بتائیں۔"

"میں کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں بتا سکوں گا" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "میں نے سُنا ہے کہ ہمارے شہر کی ایک عورت کے ساتھ اُن کے تعلقات تھے۔ میں نے کبھی توجہ نہیں دی تھی۔ والد صاحب نے اپنی کمیشن ایجنسی کا دفتر بازار سے ذرا ہٹ کر بنایا ہُوا تھا۔ میں نے سُنا تھا کہ یہ عورت کبھی کبھی وہاں جاتی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے تو کچھ بھی نہیں دیکھا صرف ایک بار ایسے ہُوا کہ شام سے کچھ پہلے میں آڑھت کے دفتر میں بیٹھا ہُوا تھا تو یہ عورت دفتر کے سامنے سے گزری اور رُک گئی۔ مجھ کو دیکھ کر ذرا سی ہنسی اور کہنے لگی کہ وہ اِدھر سے گزر رہی تھی اور مجھ کو دیکھ کر رُک گئی ہے۔"

"آپ نے کہا کہ وہ رنگین مزاج تھے" ـــــ میں نے کہا ـــــ "مجھ کو

ان میں سے دو آدمی موقع دیکھتے رہے اور ایک روز اُن کو موقع مل گیا۔ بدّ قسمتی سے بچہ ندی پر اُس طرف چلا گیا تھا جدھر گھاس اور سرکنڈے اونچے تھے۔ ان دو آدمیوں نے اُس کو پکڑ لیا اور بوری میں ڈال لیا۔ وہ بوری ایک گدھے پر لاد کر لے گئے۔

شاہ نے اپنی جان مزید ایذا رسانی سے بچانے کے لیے اقبالی بیان دے دیا اور مجسٹریٹ کے پاس جا کر بھی قلم بند کرا دیا لیکن سیشن کورٹ میں جا کر وہ اقبالی بیان سے منحرف ہو گیا اور اُس نے کہا کہ اُس کو بہت زیادہ اذیت دے دے کر بے ہوشی کی حالت میں بیان لیا گیا ہے۔ اُس کے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ اُس نے ایک بہت ہی لائق ہندو وکیل کیا تھا، لیکن میں نے ایک ایسے ملزم کو وعدہ معاف گواہ بنا لیا تھا جو قتل اور اغوا کے دونوں جرائم میں شامل تھا۔ ملزموں سے ہی میں نے ایسے بیان دلوا دیے تھے جنہوں نے ہندو وکیل کی قابلیت کو بیکار کر دیا۔ قاتل شاہ کو قرار دے دیا گیا اور اس کو سزائے موت ملی جو اپیل میں عمر قید میں تبدیل ہو گئی۔ باقی ملزموں کو بھی دو دو چار چار سال کی سزائیں ملیں۔ ان میں زیادہ سزا نمبردار کو دی گئی۔ وجہ یہ لکھی گئی کہ وہ سرکاری آ[illegible] تھا اور اُس نے اپنی سرکاری حیثیت کا غلط استعمال کیا ہے

رنگیلا بوڑھا اور بندوق

لاش وہیں پڑی تھی جہاں وہ کسی شکاری کی بندوق کا شکار ہوا تھا۔ مرنے والا امیر کبیر آدمی تھا اور وہ اس قصبے کا رہنے والا تھا جس میں میرا تھانہ تھا۔ وہ جگہ جہاں اس کی لاش پڑی ہوئی تھی قصبے سے تقریباً چار میل دور تھی۔ وہاں اُس کی بہت ساری زمین تھی جس پر اُس کے مزارعے کام کرتے تھے۔ دولت پیدا کرنے کے واسطے یہ زمین ہی کافی تھی لیکن شہر میں اس کا آڑھت کا کاروبار بھی تھا۔ اُس کے مزارعوں نے اُس کے بیٹوں کو آکر اطلاع دی تھی کہ وہ زمینوں پر مرا پڑا ہے۔ انہوں نے اتنا ہی بتایا تھا کہ اُس کا سر کھلا ہوا ہے اور وہاں خون ہی خون ہے۔

مجھ کو اطلاع ملی تو میں اپنے چند ایک آدمیوں کو ساتھ لے کر وہاں گیا۔ میں نے لاش کے سر کو دیکھا۔ زخم سر پر ہی تھے لیکن زخموں میں خون اور بال جم گئے تھے اس وجہ سے یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ زخم کس ہتھیار کے ہیں۔ جسم پر کسی اور جگہ زخم نہیں تھا نہ کسی چوٹ کا کوئی نشان تھا۔ لاش ایسی جگہ پڑی ہوئی تھی جو دوسری زمین کی نسبت گہری تھی۔ یہ جگہ ویسی ہی تھی جس کو آپ کشادہ اور لمبا نشیب کہا کرتے ہیں۔ وہاں بھی چھوٹا سا ایک کھیت تھا اور اس کھیت میں گندم اُگی ہوئی تھی۔ اُس جگہ کے دونوں طرف زمین بہت اونچی تھی۔ نشیب کے دونوں کنارے کچھ ڈھلان اور کچھ دیوار کی طرح تھے اور وہاں بہت سے درخت تھے۔

ابھی میں نے یہ پتہ نہیں لگایا تھا کہ سر کے زخم کس ہتھیار کے ہیں۔ لاش کے نزدیک کھڑوں کے جو نشان تھے وہ اُن لوگوں کے معلوم ہوتے تھے جنہوں نے لاش دیکھی تھی یا لاش کو دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ میں نے کاغذی کارروائی مکمل کر کے لاش کو پوسٹ مارٹم کے واسطے بھجوا دیا اور مزارعوں کے بیان لینے کے واسطے وہیں بیٹھ گیا۔ صاف ظاہر تھا

کہ مرنے والا قتل ہُوا ہے۔ اُس کے جو قریبی رشتہ دار وہاں موجود تھے اُن میں اُس کے دو جوان بیٹے تھے۔ وہی میرے ساتھ ساتھ رہے اور میں جو کچھ پوچھتا اُس کا جواب وہی دیتے تھے۔ ان کے ساتھ تقریباً چوبیس سال کی ایک خوبصورت لڑکی بھی تھی جس کو میں مرنے والے کی بیٹی سمجھتا رہا۔ لیکن میں نے خاص طور پر یہ نوٹ کیا کہ اُس لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تو تھے لیکن اُس کی وہ حالت نہیں تھی جو باپ کے مرنے پر بیٹیوں کی ہوتی ہے۔ مجھ کو یہ خیال بھی آیا کہ یہ مرنے والے کی بہو ہو گی لیکن میں یہ سُن کر کچھ حیران ہُوا کہ یہ مرنے والے کی بیوی ہے جو اب بیوہ ہو گئی تھی۔

یہ پتہ لگا تو میرے دماغ میں کچھ شکوک پیدا ہوئے۔ مرنے والا یقیناً قتل ہُوا تھا لیکن زخم ایسے تھے کہ یہ پتہ نہیں لگتا تھا کہ ہتھیار کون سا استعمال ہُوا ہے۔ سامنے پیشانی میں دو تین سوراخ نظر آتے تھے ان سے مجھ کو یہ شک ہُوا تھا کہ پیچھے سے شکاری بندوق کا کارتوس اس پر چلایا گیا ہے اور اس کے دو تین چھرے سامنے سے باہر نکلے ہیں۔ اگر یہ زخم شکاری بندوق کے کارتوس کا ہی تھا تو ہو سکتا تھا کہ شکاری نے نشیب کے اونچے کنارے پر کھڑے ہو کر کسی درخت کی نیچے والی ٹہنی پر بیٹھے ہوئے پرندے پر گولی چلائی تو اُس کے چھرے اس کو لگ گئے، اور اگر یہ واردات قتل کی تھی تو اس میں اُس جوان لڑکی کا ضرور ہاتھ تھا جو مرنے والے کی بیوی تھی۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ مرنے والے کی عمر پینتالیس اور پچاس سال کے درمیان تھی اور یہ لڑکی اُس کی تیسری بیوی تھی جس کے ساتھ اُس نے اڑھائی تین سال پہلے شادی کی تھی۔

آپ نے قتل کی کہانیوں میں بہت دفعہ پڑھا ہو گا کہ جہاں بوڑھا خاوند، جوان بیوی اور جوان بیٹا ایک ہی گھر میں اکٹھے ہو جائیں تو وہاں اس طرح کی واردات ہو جانا عجوبہ نہیں ہوتا۔ میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار کرنا تھا لیکن میں اتنا وقت ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ میں مرنے والے کو اب مقتول ہی کہوں گا۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ اُس نے خودکشی نہیں کی تھی۔ دماغ میں رکھ کر کہ یہ قتل ہُوا ہے، میں نے اُس کے بڑے بیٹے کو

اپنے پاس الگ بٹھایا اور سب سے پہلے یہ پوچھا کہ اُن کی کسی کے ساتھ خاندانی دشمنی ہے؟

"نہیں" ——اُس نے جواب دیا —— "کوئی خاندانی دشمنی نہیں"۔

اُن کی رنگینیوں کی تفصیل درکار ہے"۔

"خوبصورت عورت کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے" ——اُس نے کہا۔ "اپنے آپ کو جوان سمجھتے تھے"۔

میں نے اُس سے بہت ساری باتیں پوچھیں لیکن اُس نے کوئی ٹھوس واقعہ نہ سنایا نہ کوئی ایسی مثال دی جس سے یہ پتہ لگتا کہ مقتول کی رنگینیاں کیسی تھیں۔ ایسے رنگین مزاج لوگ جو خوبصورت عورتوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، اکثر اسی انجام کو پہنچتے ہیں۔ مقتول کے اس جوان بیٹے نے کوئی ٹھوس بات بتائی تو نہیں لیکن میرے واسطے یہ اشارہ کافی تھا کہ مقتول رنگین مزاج تھا۔ میری نظر میں اُس کا یہ بیٹا اور اُس کی جوان بیوی مشتبہ تھے۔

"اپنی سوتیلی ماں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟" ——میں نے پوچھا —— "کیا ان میں آپس میں پیار محبت تھا یا آپ نے ان میں کبھی کھچاؤ دیکھا تھا؟"

"میں آپ کا مطلب سمجھتا ہوں" ——اُس نے کہا —— "یوں سمجھ لیں کہ ان کے درمیان نہ محبت تھی نہ کھچاؤ تھا۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اتنی جوان لڑکی جوان اولاد والے باپ کے ساتھ کیسے خوش رہ سکتی ہے"۔

"میرے ساتھ ذرا تعاون کریں" ——میں نے کہا —— "آپ پڑھے لکھے ہیں۔ ذہین بھی معلوم ہوتے ہیں اور میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ آپ اس پر خوش نہیں تھے کہ آپ کے والد صاحب نے ایک جوان لڑکی کے ساتھ شادی کی ہے۔ میرے اس سوال سے آپ کو ناراض نہیں ہونا چاہیے کہ اس لڑکی کے چال چلن کی بابت آپ کیا کہتے ہیں۔ کیا آپ کو کبھی شک ہوا ہے کہ اس لڑکی کے تعلقات کسی اور کے ساتھ تھے؟"

"تقریباً دو سال پہلے ایک واقعہ ہوا تھا" ——اُس نے جواب دیا ——

"اس کے بعد کوئی ایسی شہادت سامنے نہیں آئی؟"

"وہ واقعہ کیا تھا؟"

"میری سوتیلی ماں ہمارے ہی شہر کی رہنے والی ہے"— اُس نے جواب دیتے ہوئے کہا — "ان کا محلّہ ذرا دور ہے۔ اس کی شادی کو تقریباً ایک سال ہو گیا تھا۔ ایک روز دن کے وقت میں باہر سے آیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مجھ کو چونکہ اس لڑکی پر شک رہتا تھا اس واسطے دروازہ میں نے آہستہ کھٹکھٹایا۔ شک تو مجھ کو اسی وجہ سے ہو گیا تھا کہ دروازہ اندر سے کیوں بند تھا۔ مجھ کو معلوم تھا کہ والد صاحب زمینوں پر گئے ہوئے ہیں۔ آپ ہمارا گھر دیکھیں گے، بہت بڑی حویلی ہے۔ دروازہ نہ کھلا تو میں دوسری طرف سے دیوار پر چڑھا اور صحن میں اُتر گیا۔ اُن دنوں مجھ کو کھانسی لگی ہوئی تھی۔ میں خاموشی سے اس لڑکی کے کمرے میں جانا چاہتا تھا لیکن کھانسی آگئی جس کو میں روک نہ سکا۔ میرے کھانسنے کے ساتھ ہی لڑکی ایک کمرے سے دوڑتی ہوئی نکلی اور کہنے لگی کہ خدا کا شکر ہے کہ تم آگئے ہو۔ یہ دیکھو بدمعاش زبردستی اندر آگیا ہے اور مجھ کو دھمکیاں دیتا ہے....

"میں کمرے میں جانے لگا تو اُسی کے محلّے کا ایک نوجوان جس کا نام اشفاق تھا اندر سے نکلا۔ میری سوتیلی ماں نے سخت غصّے کی حالت میں اُس کو گالیاں دینی شروع کر دیں اور مجھ کو کہنے لگی کہ اس کا سر پھاڑ دو۔ اس سے تو مجھے خدا نے بچایا ہے.... میں ہاکی سٹک لانے کے لیے ایک کمرے کی طرف دوڑا اور اشفاق باہر کو بھاگ گیا۔ میں ہاکی سٹک اُٹھا کر باہر کو جانے لگا تو میری سوتیلی ماں نے مجھ کو آگے آکر روک لیا۔ کہنے لگی کہ اُس کے پیچھے نہ جانا۔ جس نے اتنی دلیری کی ہے کہ ہمارے گھر میں آگیا، اندر سے کُنڈی لگالی اور میرے اوپر دست درازی کی ہے وہ اکیلا نہیں ہوگا۔ کل تمہارے ابا آرہے ہیں۔ انہیں بتائیں گے....

"یہ تو ہماری بزدلی اور بے غیرتی تھی کہ چپ رہتے۔ ہمارے خاندان کی حیثیت اُونچی ہے۔ ہم معمولی لوگ نہیں کہ اشفاق جیسے معمولی آدمی کا

اتنا بڑا جرم معاف کر دیتے۔ میرا چھوٹا بھائی بھی گھر نہیں تھا لیکن میں اشفاق کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میری سوتیلی ماں نے ایسے طریقے سے مجھ کو روکا کہ میں اُس کی بات مان گیا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ وہ اپنے بھائیوں کو بھی بتائے گی۔"

دوسرے دن کی بجائے اُسی رات کو مقتول زمینوں سے واپس آگیا۔ اُس کی زمینیں دُور نہیں تھیں۔ چار میل کا فاصلہ تھا۔ مجھ کو یہ بھی بتایا گیا کہ مقتول مہینے ڈیڑھ مہینے بعد زمینوں پہ جاتا تھا اور ہر بار آٹھ دس دن وہیں رہتا تھا۔ وہاں اُس نے چھوٹا سا مکان بنایا ہوا تھا۔ میں اسی مکان میں بیٹھا ہوا تفتیش کر رہا تھا۔

مقتول کے بڑے بیٹے نے مجھ کو سُنایا کہ مقتول زمینوں سے واپس آگیا تو بیٹے نے اور بیٹے کی سوتیلی ماں نے اُس کو بتایا کہ گھر میں کیا واقعہ ہُوا ہے۔

"اور تم نے اُس کو (اشفاق) زندہ چھوڑ دیا ہے؟" ـــــ مقتول نے اپنے بیٹے کو غصّے سے کہا ـــــ "صبح ہونے دو۔"

"اسے میں نے روک لیا تھا" ـــــ مقتول کی بیوی نے کہا ـــــ "یہ اکیلا تھا اور اشفاق بدمعاش ہے۔"

"صبح ہونے دو" ـــــ مقتول نے کہا ـــــ "اب تو بہت دیر ہو گئی ہے۔"

مقتول کی بیوی کا نام مقصودہ تھا اور سُودی کہلاتی تھی۔ بڑے بیٹے نے مجھ کو بتایا کہ سُودی نے مقتول کو کہا تھا کہ اس معاملے کو یہیں دبا دے سارے شہر میں اپنی ہی رسوائی ہو گی لیکن مقتول اتنا بھڑکا ہُوا تھا کہ اُس نے سُودی کو بھی اور اپنے بیٹے کو بھی بے غیرت کہا اور اُس نے وہ رات غصّے میں گزاری۔ مقتول کا ایک اور بیٹا بھی تھا جس کی عمر سولہ سترہ سال تھی۔ وہ تو باپ سے زیادہ غصّے میں تھا۔

مقتول نے اشفاق کے باپ کو جا کر شکایت نہ کی کہ اُس کے بیٹے نے یہ حرکت کی ہے بلکہ اشفاق کو اپنے دو آدمیوں سے بہت پٹوایا۔ انہوں

نے اشفاق کو بازار میں پکڑ لیا تھا۔ مقتول اُن کے ساتھ تھا یا اُن کی اطلاع پر آ گیا تھا۔ اس کے بعد اشفاق کا باپ مقتول کے پاس گیا اور گلہ کیا کہ اُس کے بیٹے کو مارا پیٹا گیا ہے۔ مقتول نے اُس کی بھی بے عزتی کی اور اُس کو بتایا کہ اُس کے بیٹے نے کیا کیا ہے۔

اس کے بعد مقتول کے دونوں بیٹے اشفاق کے پیچھے پڑ گئے۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کر دیا اور اشفاق اِن کے ہاتھوں زدو کوب نہ ہوا۔ یہ بات سارے شہر میں اُڑ گئی کہ اشفاق ملک رحمت اللہ کے گھر میں گھس گیا تھا۔

"اشفاق بھی کچھ کہتا ہوگا!" ــــ میں نے کہا۔

"کچھ بھی نہیں" ــــ مقتول کے بڑے بیٹے نے کہا ــــ "وہ ہر کسی کی لعنت ملامت سُنتا تھا اور چُپ رہتا تھا۔"

"کیا وہ واقعی بدمعاش ہے؟" ــــ مَیں نے پوچھا۔

"ایسا بڑا بدمعاش بھی نہیں تھا" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "زندہ دل اور دلیر جوان ہے۔"

"اُس نے کچھ تو کہا ہوگا" ــــ میں نے کہا ــــ "لوگ اُس سے پوچھتے ہوں گے اور وہ کچھ تو کہتا ہوگا۔ یہ تو ضرور کہتا ہوگا کہ اپنی بے عزتی کا بدلہ لوں گا۔ وہ آپ کا نوکر یا ملازم تو نہیں تھا کہ دبک کر بیٹھ جاتا۔ اُس کی بات آپ تک پہنچانے والے آپ کے دوست تھے دوسرے لوگ تھے۔"

"ہم خود معلوم کرتے رہے کہ وہ کیا کہتا ہے" ــــ مقتول کے بیٹے نے کہا ــــ "ہمیں کچھ بھی معلوم نہ ہوا۔ وہ اپنے گھر میں قید ہو گیا تھا۔ اُس کے باپ اور بڑے بھائی نے بھی اُس کی پٹائی کی ہو گی.... اصل بات یہ ہے ملک صاحب! ہمارے مقابلے میں اشفاق اور اُس کے خاندان کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔"

"حیثیت ہے یا نہیں" ــــ مَیں نے کہا ــــ "اُس نے بہت بڑا جرم کیا ہے۔ اتنی اونچی حیثیت اور طاقت رکھنے والے گھر میں داخل ہونا اور گھر کی عزت پر ہاتھ ڈالنا اتنی زیادہ ہمت اور جرأت کا کام ہے جو

کوئی معمولی آدمی نہیں کر سکتا۔ ایسے دلیر آدمی کی مار پٹائی ہو تو وہ خاموش نہیں رہ سکتا" — مجھ کو اچانک ایک خیال آ گیا۔ میں نے آگے ہو کر آہستہ سے مقتول کے بیٹے سے پوچھا — "کیا ایسا تو نہیں کہ آپ کی سوتیلی ماں نے اس کو خود بلایا ہو؟"

"توبہ کرو جی!" — اُس نے کہا — "یہ لڑکی ایسی حرکت کرتی تو آج آپ کو یہاں کھڑی نظر نہ آتی۔ یہ آپ دل سے نکال دیں۔"

"دیکھو میاں!" — میں نے کہا — "میں یہ نہیں پوچھ رہا کہ شہر میں حیثیت کس کی اونچی ہے، نہ مجھ کو کہانیاں سننے میں دلچسپی ہے۔ مجھ کو یہ بتاؤ کہ میں اگر یہ کہوں کہ اشفاق نے آپ کے والد صاحب سے اس طرح انتقام لیا ہے کہ ان کو قتل کر دیا ہے تو آپ کیا کہیں گے؟"

"مجھ کو ایسا کوئی شک نہیں" — اُس نے جواب دیا — "اشفاق تو اُسی وقت سمجھو مر گیا تھا۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ پہلے تو وہ بہت دن اپنے گھر میں قید رہا پھر وہ باہر نکلنے لگا تو کسی کے ساتھ بات ہی نہیں کرتا تھا۔ اب آ کر، دو سال بعد، اُس نے کچھ بولنا شروع کیا ہے۔ اگر میری سوتیلی ماں نے اُس کو خود بلایا ہوتا تو کیا وہ چپ رہتا اور چھپ کر کے مار کھا لیتا؟ وہ تو چلا چلا کر کہتا کہ اُس کو لڑکی نے خود بلایا تھا.... پھر جناب! یہ بھی سوچیں کہ اس واقعہ کو دو سال گزر گئے ہیں۔ اگر اشفاق میں انتقام لینے کا دم ہوتا تو وہ فوراً لے لیتا۔ اُس کے باپ اور بڑے بھائی نے میرے والد صاحب کے پاس آ کر معافی مانگی تھی۔"

میں اِس شخص کی اتنی لمبی کہانی اِس لیے سنتا رہا کہ اسی میں سے مجھ کو قاتل کا سراغ مل جائے گا مگر مجھ کو ناکامی ہوئی۔ یہ ٹھیک تھا کہ دو سال گزر گئے تھے۔ صرف خاندانی اور دیرینہ دشمنیوں والے انتقام لینے کے لیے اتنا انتظار کر لیا کرتے ہیں۔ وہ دشمنیاں دائمی ہوتی ہیں لیکن یہ واقعہ اچانک ہو گیا تھا۔ اشفاق نے انتقام لینا ہوتا تو دو سال انتظار نہ کرتا۔ اس کے علاوہ وہ مجرم بھی تھا۔ میں نے اشفاق کو قتل کی اس واردات میں مشتبہ تو نہ سمجھا لیکن اُس کو اپنے دماغ میں محفوظ رکھ لیا۔

بڑے بیٹے کو باہر بھیج کر اس کے چھوٹے بھائی کو بلایا۔ یہ جوشیلا نوجوان تھا۔ اُس نے بھی یہ واقعہ میرے کہنے پر سُنایا اور اُس نے بھی یہی رائے دی کہ اشفاق میں انتقام کی ہمت نہیں تھی۔

"تمہاری سوتیلی ماں کا تمہارے والد کے ساتھ سلوک کیسا تھا؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"میرے والد صاحب سخت طبیعت کے آدمی تھے" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "گھر میں ہی نہیں، سارے خاندان میں کوئی فرد اُن کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کر سکتا تھا جو اُنہیں پسند نہیں ہوتا تھا۔"

"میں نے سُنا ہے کہ وہ رنگین مزاج تھے" ــــ میں نے کہا ــــ "میرا مطلب ہے وہ زندہ دل تھے۔"

"آپ نے ٹھیک سُنا ہے" ــــ اُس نے کہا ــــ "لیکن کسی کے آگے جھکتے نہیں تھے۔ اپنی اس بیوی کو انہوں نے اپنے دماغ پر سوار نہیں کیا تھا۔"

"کیا اس پر رُعب جھاڑا کرتے تھے؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"کبھی کبھی" ــــ اُس نے جواب دیا۔

"عموماً کس بات پر؟" ــــ میں نے پوچھا ــــ "کیا وہ کوئی ایسی ویسی حرکت کرتی تھی؟ اپنے ماں باپ کے گھر زیادہ جاتی تھی؟"

"کوئی خاص بات نہیں ہوتی تھی" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "اُسے اپنے ماں باپ کے گھر جانے سے میرے والد صاحب نے کبھی نہیں روکا تھا۔ وہ انہیں بتا کر چلی جاتی اور آجاتی تھی۔ دوسرے محلے میں ان کا گھر ہے۔"

میں مقصودہ کا چال چلن معلوم کرنا چاہتا تھا اور میں یہ معلوم کرنے کی بھی کوشش میں تھا کہ ان دونوں جوان سوتیلے بیٹوں کے ساتھ مقصودہ کے تعلقات کیسے تھے۔ میں نے دیکھا کہ یہ نوجوان بچ بچ کر جواب دیتا تھا۔ اُس کی کسی بات سے مجھ کو شک ہو جاتا اور کسی بات سے شک رفع ہو جاتا۔ میں نے مقتول کے گھر کے حالات دوسرے ذریعوں سے معلوم کرنے تھے۔

مقصودہ کو بلا کر اُس سے کچھ باتیں پوچھیں۔ میں اُس سے یہ توقع نہیں رکھ سکتا تھا کہ وہ اپنی بابت مجھ کو پوشیدہ باتیں بتا دے گی۔ میں نے اُس

کو دو سال پہلے والا واقعہ یاد دلایا تو اُس نے اُسی طرح سُنایا جس طرح مقتول کے دونوں بیٹوں نے سُنایا تھا۔

"مقصودہ!" ___ میں نے کہا ___ "مَیں جانتا ہوں تمہیں اپنے خاوند کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں۔ مَیں صرف یہ پتہ لگا رہا ہوں کہ اُس کا قاتل کون ہے.... تم کسی پر شک کرتی ہو؟"

"میرا شک کسی پر بھی نہیں" ___ اُس نے جواب دیا ___ "مجھ کو اُن کے مرنے کا بہت افسوس ہے۔"

"جھوٹ نہ بولو مقصودہ!" ___ مَیں نے کہا ___ "مجھ کو اس کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں کہ تمہیں افسوس ہے کہ نہیں۔ مجھ کو یہ بتاؤ کہ تمہارا خاوند جائیداد اپنے بیٹوں میں تقسیم تو نہیں کر رہا تھا؟"

"نہیں" ___ اُس نے جواب دیا ___ "نہ بیٹوں نے کبھی مطالبہ کیا تھا نہ باپ نے کبھی سوچا تھا۔"

"ان کا باپ کیسا آدمی تھا؟"

"اچھا تھا" ___ اُس نے جواب دیا۔

"مَیں کچھ اور پوچھ رہا ہوں" ___ مَیں نے کہا ___ "سُنا ہے اُس کے تعلقات دوسری عورتوں کے ساتھ بھی تھے.... ذرا سوچو مقصودہ! مَیں قاتل کو پکڑنا چاہتا ہوں۔ مجھ کو شک ہے کہ تمہارا خاوند کسی عورت کے پیچھے مارا گیا ہے۔ مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپاؤ۔"

"میں کیسے چھپا سکتی ہوں جی!" ___ اُس نے کہا ___ "یہ تو سب جانتے ہیں کہ اُن کے تعلقات ایک بدمعاش عورت کے ساتھ تھے۔ اُس کا خاوند مریض سا آدمی ہے اور اس عورت کے دو بھائی ہیں۔ مجھ کو عورتوں نے بتایا تھا کہ ملک صاحب (مقتول) اُس کے جال میں آئے ہوئے ہیں۔ یہ عورت جوان بھی ہے اور خوبصورت بھی ہے۔ کئی بار میرے گھر آئی ہے۔ بہت چالاک عورت ہے۔"

یہ وہی عورت تھی جس کا ذکر مقتول کے بڑے بیٹے نے کیا تھا۔

"تم نے اپنے خاوند کو اس معاملے میں کچھ کہا تو ضرور ہوگا" ___ میں نے کہا۔

"صرف ایک بار کہا تھا" ___ اُس نے جواب دیا ___ "لیکن اُنھوں نے مجھ کو ڈانٹ دیا تھا۔ اس کے بعد میں نے نہیں کہا۔"

میں نے اُس کے ساتھ ہمدردی کی باتیں شروع کر دیں کہ اُس کو ایک بوڑھے آدمی کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے۔ ایک تو وہ بوڑھا ہے اور اس کے ساتھ وہ بدکار ہے۔ میں بات کرنی جانتا تھا۔ یہ تو ناتجربہ کار لڑکی تھی۔ اُس پر میری باتوں کا جادو چل گیا۔ میری ہمدردی نے اُس کے آنسو نکال دیئے۔ یہ میرے واسطے کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ وہ اپنی عمر سے دُگنی عمر کے آدمی کی بیوی بنا دی گئی تھی۔ اُس کو ہمدردی کی ضرورت تھی۔

میں نے اُس کو اتنا موم کر دیا کہ وہ خود بولنے لگی۔ میں اُس کو اور زیادہ بھڑکاتا گیا۔ میں اُس کی باتوں سے سُراغ لینا چاہتا تھا لیکن وہ کچھ اور طرح کی باتیں کر رہی تھی۔ میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ لڑکی میں چالاکی اور فریب کاری کتنی کچھ ہے۔ مجھ کو اُس میں ایسی کوئی مشکوک بات نظر نہیں آ رہی تھی۔

وہ مقتول کی ذات کی لڑکی نہیں تھی اور لڑکی کی ذات چھوٹی بھی نہیں تھی اور اُس کا خاندان مالی لحاظ سے مقتول کے مقابلے میں بہت نیچے تھا۔ مقصودہ نے صاف بتایا کہ مقتول اُس کے ماں باپ پر بہت مہربان ہو گیا تھا اور اُن کو وہ وقتاً فوقتاً پیسے دیتا رہتا تھا۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ مقتول نے اس لڑکی کو خرید کر اپنی بیوی بنا لیا تھا۔

اس لڑکی کی باتوں سے پتہ لگتا تھا کہ یہاں معاملہ اُلٹ ہے۔ وہ اس طرح کہ عام طور پر بوڑھے خاوندوں کی نوجوان بیویاں خاوندوں پر غالب آجاتی ہیں۔ خاوند اپنی کمزوریوں کو سمجھتے ہوئے نوجوان بیویوں کے زن مرید بن جاتے ہیں اور ان کی ہر فرمائش اور خواہش پوری کرتے ہیں۔ ایسی بیویاں اپنے بوڑھے خاوندوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کسی جوان آدمی کو اپنا در پردہ ساتھی بنا لیتی ہیں لیکن مقصودہ کا کیس اُلٹ تھا۔ خاوند نے اُس کو زر خرید لونڈی بنایا ہوا تھا۔ گھر میں اس لڑکی کی یہی حیثیت تھی۔ اُس نے اپنا من مار لیا تھا۔

"آپ نے ٹھیک کہا تھا کہ مجھ کو ملک صاحب کے مرنے کا ذرا بھی افسوس نہیں" ــــ اُس نے کہا اور مجھ سے پوچھا ــــ "کیا آپ کو پتہ لگا ہے کہ اس کو کس نے مار دیا ہے؟"

"یہی پتہ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں" ــــ میں نے کہا اور اپنے ایک خیال کے مطابق اُس سے پوچھا ــــ "تم اب کیا کرو گی؟ .... اپنے ماں باپ کے پاس چلی جاؤ گی پھر ظاہر ہے شادی کر لو گی! ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے خدا نے تمہاری فریادیں سُن لی ہیں۔"

"شادی سے تو دل مر گیا ہے" ــــ اُس نے کہا ــــ "پتہ نہیں میں کیا کروں گی۔"

"لعنت بھیجو مرنے والے پر!" ــــ میں نے اُس کے دل کی بات معلوم کرنے کے واسطے کہا ــــ "ایسے آدمیوں کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔ مجھ کو تمہارے ساتھ ہمدردی ہے۔ تم اپنے دل کو نہ مارو۔ اتنی جوان اور اتنی خوبصورت لڑکی ہو۔ عدت کا عرصہ پورا ہوتے ہی شادی کر لینا۔ مجھ کو ایسی بات پوچھنی تو نہیں چاہیے۔ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ اپنی دلچسپی اور تمہاری ہمدردی کی خاطر پوچھ رہا ہوں۔ اس کو تفتیش نہ سمجھنا.... تمہارے دل میں اپنی کوئی پسند تو ضرور ہو گی"۔

وہ شرما کر ہنس پڑی اور سر جھکا لیا۔

"اس میں شرمانے والی کوئی بات نہیں" ــــ میں نے کہا ــــ "ہر جوان لڑکے اور لڑکی کے دل میں شادی سے پہلے اپنی پسند ہوتی ہے۔ بعض کی تو آپس میں بات چیت بھی ہوتی ہے۔ میں تمہیں یہ مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ تمہاری پسند کے آدمی نے اگر ابھی تک شادی نہیں کی تو اُس کے ساتھ شادی کر لینا.... ہے کوئی ایسا؟"

"نہیں" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "لیکن آپ کے مشورے پر عمل کروں گی"۔

میں نے بہت جال پھینکے اور ہوا میں بہت تیر چلائے لیکن اُس نے اپنی پسند کے کسی آدمی کا نام نہ لیا۔ مجھ کو یہ شک تھا کہ اس نے اپنی پسند کے کسی آدمی کے ساتھ شادی کرنے کے واسطے اپنے خاوند کو مروا

دیا ہے لیکن وہ مجھ کو اتنی چالاک اور ہوشیار نہیں لگتی تھی۔

"میں آپ کو اپنا ایک شک بتاؤں؟" ـــــ اُس نے پوچھا اور کہنے لگی ـــــ "صفیہ کے بھائیوں اور خاوند کو پکڑیں۔ اُس کے خاوند کا بھی ایک بھائی ہے۔"

"کوئی شہادت ملے تو پکڑوں!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "تم نے یہ بات کیوں کہی ہے؟"

"پہلے ملک صاحب اور صفیہ کے تعلقات کی بابت کسی کو پتہ نہیں لگا" ـــــ مقصودہ نے کہا ـــــ "آہستہ آہستہ یہ بات کھلتی گئی۔ صفیہ کا خاوند اور بھائی وغیرہ سمجھتے ہوں گے کہ صفیہ پر یہ الزام غلط ہے لیکن اب انہوں نے بھی مان لیا ہے۔ عورتوں کی زبانی یہ بات مجھ تک پہنچی ہے کہ خاوند نے اور بھائیوں نے صفیہ کو بہت مارا پیٹا ہے۔ صفیہ کے بھائی کہتے ہیں کہ وہ ملک صاحب کو جان سے مار ڈالیں گے۔"

"نہیں مقصودہ!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "لوگ ایسے ہی کہا کرتے ہیں۔ یہ خالی دھمکیاں ہوتی ہیں۔"

"نہیں جی!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "میں نے اس کو خالی دھمکی نہیں سمجھا۔ صفیہ کی ساس نے میری ماں کو کہا تھا کہ اُس کے بیٹے یعنی صفیہ کے خاوند اور صفیہ کے بھائیوں کی نیت ٹھیک نہیں۔ اُس نے میری ماں کو یہ کہا تھا کہ مقصودہ کو کہو کہ اپنے خاوند کو خبردار کر دے ورنہ وہ ایسے طریقے سے مارا جائے گا کہ کسی کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ اس کو کون مار گیا ہے۔"

"پھر تم نے اپنے خاوند کو بتایا تھا؟" ـــــ میں نے پوچھا۔

"نہیں" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "میں تو اس معاملے میں ایک ہی بار بات کر کے اپنی بے عزتی کروا چکی تھی" ـــــ وہ چُپ ہو گئی۔ کچھ دیر میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی ـــــ "ایک بات آپ کو بتاؤں آپ مجھ کو ہی گرفتار نہ کر لیں.... سچی بات ہے میں چاہتی ہی یہی تھی کہ اس ملک صاحب کو کوئی پار کر دے۔ میری تو جان چھوٹے۔"

"نہ مقصودہ!" ـــــ میں نے ہنستے ہوئے کہا ـــــ "اس بات پر تو میں

تمہیں گرفتار نہیں کروں گا۔ میرا خیال ہے تم نے صفیہ کی ساس کو یہ بھی کہا ہو گا کہ یہ آدمی باز آنے والا نہیں۔ اسے کھنگال ہی ڈالو تو اچھا ہے"۔

"آپ نے میرے دل کی بات کہی ہے"۔ ـــــ مقصودہ نے کہا ـــــ "لیکن میں نے ایسا کہا نہیں"۔

میں نے اس لڑکی کو اپنے ساتھ بہت بلکہ پورا بے تکلف کر لیا تھا یہاں تک کہ میں نے اُس کے ساتھ ہنسی مذاق کی باتیں کیں تو وہ اس سے لطف اُٹھاتی اور ہنستی رہی جیسے ہم بڑے پرانے دوست ہوں۔ میں نے باتوں میں اور ایک آدھ حرکت کے ذریعے یہ جانچنے کی کوشش بھی کی کہ یہ چال چلن کی کیسی ہے۔ میں آپ کو یہ باتیں نہیں سُنا رہا جو میں نے اُس کے ساتھ کی تھیں۔ صرف یہ رائے دیتا ہوں کہ وہ چال چلن کی ڈھیلی نہیں تھی لیکن اتنی زیادہ بے تکلفی کے باوجود اُس کی زبان سے کوئی ایسا لفظ نہ نکلا جس سے مجھ کو شک ہوتا کہ قتل کی اس واردات میں اس کا بھی ہاتھ ہے۔

"ایک بات بتاؤ مقصودہ!" ـــــ میں نے کہا ـــــ تم نے مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ یہ بات بھی صحیح صحیح بتا دو۔ ملک صاحب کے دونوں بیٹوں کا تمہارے ساتھ رویہ کیا تھا.... دونوں جوان ہیں۔ تم بھی جوان ہو۔ تم نے ان کی نیت بھانپی ہو گی"۔

"چھوٹا تو مجھ سے پرے پرے رہتا تھا" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "بڑا بیٹا میرے زیادہ قریب رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ میرا خیال ہے اُس کی نیت میں کچھ گڑبڑ تھی لیکن میں اُس کو ایسا موقع نہیں دیتی تھی کہ وہ نیت کا اظہار کرتا"۔

میں ابھی ان سب کو سونگھ رہا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بعد میں نے تفتیش میں گرماگرمی پیدا کرنی تھی۔ میں نے یہ سوچ کر کہ مقتول کے دونوں بیٹوں کو اور مقصودہ کو بھی اپنے گھر ہونا چاہیے کیونکہ لاش آچکی ہو گی یا آنے والی ہو گی، ان تینوں کو کہا کہ وہ شہر چلے جائیں۔ میں وہیں رہا۔ وجہ

یہ تھی کہ مجھ کو ایک اور شک تھا۔ اس شک کے واسطے میں نے مزارعوں کو بلایا اور باری باری سب سے پوچھا کہ اس علاقے میں مقتول کے تعلقات کسی عورت کے ساتھ ہوں گے یا کوئی عورت یہاں اس کے پاس آتی ہو گی۔ سب نے انکار کر دیا۔ کسی نے کہا کہ یہاں باہر کی کوئی عورت نہیں آتی اور باقی کہتے تھے کہ انہیں معلوم ہی نہیں۔

سورج ڈوب گیا۔ میں تھانے کو روانہ ہو گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل راستے میں ملا۔ اس نے مجھ کو پوسٹ مارٹم رپورٹ دی۔ مقتول کے سر کے پچھلی طرف سے بندوق کے چھرے داخل ہوئے جن میں سے کچھ کھوپڑی کے اندر رہ گئے اور تین چار سلامنے سے نکل گئے۔ ڈاکٹر کی رپورٹ یہ تھی کہ یہ بندوق کے کارتوس کے چھرّے تھے۔ ڈاکٹر یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ کارتوس کتنی دُور سے چلایا گیا۔ ڈاکٹر نے یہ بھی لکھا تھا کہ سَر کی پچھلی طرف جو چھرے لگے وہ کتنی دُور دُور تھے۔ ایک جگہ سے کھوپڑی بالکل کھُل گئی تھی یعنی اُس میں خاصا بڑا سوراخ ہو گیا تھا۔ اس سے میں نے اپنے تجربے کے مطابق اندازہ کیا کہ کارتوس زیادہ دُور سے نہیں چلایا گیا۔ اگر فاصلہ زیادہ ہوتا تو چھرّے پھیل جاتے۔ یہ چھرے جو مقتول کی کھوپڑی سے نکلے تھے عدالت میں پیش کرنے کے واسطے ایگزبٹ کے طور پر محفوظ رکھتے تھے۔ میں نے جب یہ چھرّے دیکھے تو یہ پرندے مارنے والے کارتوس کے چھرے تھے۔

میرے سامنے اب مسئلہ یہ آ گیا کہ یہ واردات قتل (۳۰۲) کی ہے یا یہ حادثاتی قتل (۳۰۴) ہے۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ نشیب کے اونچے کنارے سے کسی شکاری نے درخت پر بیٹھے ہوئے پرندے پر کارتوس فائر کیا مگر وہ یہ نہ دیکھ سکا کہ نیچے چھرّوں کے راستے میں ایک آدمی کھڑا ہے۔

میں نے ایک چیز کا ذکر نہیں کیا۔ مقتول کے سَر پر ترکی ٹوپی تھی جو اُس دَور میں بہت عام تھی اور یہ ٹوپی مسلمانوں کے لباس کا حصّہ تھی۔ کچھ چھرّے اس ٹوپی میں سے گزرے تھے۔ اس وجہ سے ان کی رفتار کم ہو گئی۔ اور یہ کھوپڑی میں رہ گئے۔

میں نے نامعلوم قاتل کے خلاف ایف۔ آئی۔ آر تحریر کر کے اُس

کی نقلیں متعلقین کو بھجوا دیں۔ وہ انگریزوں کی حکومت تھی۔ قتل کو اتنی آسانی سے خودکشی یا حادثاتی موت نہیں لکھا جاسکتا تھا جتنی آسانی سے آج لکھ دیا جاتا ہے۔ علاقہ ڈی ایس پی نے جو انگریز تھا، بذریعہ ٹیلی فون مجھ کو حکم دیا کہ تفتیش کرو اور واقعاتی شہادت اکٹھی کرو۔ اگر ذرا سا بھی شک ہوتا ہے کہ یہ قتل کی واردات ہو سکتی ہے تو اس کو قتلِ عمد کی واردات سمجھ کر تفتیش جاری رکھو۔

میں نے غور کیا تو مجھ کو واقعاتی شہادت نظر آنے لگی۔ پھر یہ وجہ بھی نظر آنے لگ گئی کہ میں جو ایک سب انسپکٹر تھا یہ فیصلہ کرنے کا خطرہ اپنے سر نہیں لے سکتا تھا کہ یہ حادثاتی موت ہے۔ مقتول کا رنگین مزاج ہونا، غیر عورتوں کے ساتھ تعلقات اور اس عمر میں گھر میں نوجوان بیوی کی موجودگی اچھی خاصی واقعاتی شہادت تھی۔ میں نے اس جگہ کے ارد گرد اچھی طرح دیکھا تھا جہاں سے لاش ملی تھی۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ مقتول اتفاقیہ طور پر کسی شکاری کے چھرّوں کے راستے میں آ گیا تھا۔

میں نے رات کو ہی صفیہ کے خاوند، اس کے دونوں بھائیوں اور اس کی ساس کو تھانے بلایا۔ سب سے پہلے ساس کو اندر بلایا۔

"تم نے کہا تھا کہ تمہارا بیٹا جو صفیہ کا خاوند ہے اور صفیہ کے بھائی ملک رحمت اللہ کو قتل کر دیں گے" ___ میں نے کہا ___ "مجھ کو یہ بتاؤ کہ انھوں نے بات کہی تھی یا نہیں۔"

"نہ جی!" ___ اس نے جواب دیا ___ "انہوں نے ایسی بات کبھی نہیں کہی۔ ان کو ایسی بات کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی!"

"ضرورت یہ تھی" ___ میں نے اس کی طرف جھک کر کہا ___ "کہ تمہاری بہو صفیہ کے ساتھ ملک رحمت اللہ کے ناجائز تعلقات تھے.... بتاؤ، تھے یا نہیں؟"

"مجھ کو تو معلوم نہیں" ___ اس نے کہا ___ "دشمنوں نے ویسے ہی اڑا دی ہو گی۔"

"میری بات غور سے سنو خالہ!" ـــــ میں نے کہا ـــــ "تم عزت والے خاندان کی عورت ہو۔ مجھ سے عزت کراؤ اور اپنے گھر کی عزت کا خیال کرو۔ تم جھوٹ بولو گی تو میں دوسروں سے پتہ لگا لوں گا۔ پھر تم اس تھانے سے باہر نہیں جا سکو گی۔ پھر میں تمہاری بہو کو بھی تھانے بلا لوں گا۔ سوچو، پھر تمہاری کیا عزت رہے گی۔"

"چلو وہ تو میں مان لیتی ہوں" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "لیکن یہ جو آپ نے کہا ہے کہ میرے بیٹے نے ملک رحمت کو قتل کی دھمکی دی تھی یہ غلط ہے۔"

"یہ تو مانتی ہو ناکہ تمہاری بہو کے اور ملک رحمت کے قابل اعتراض تعلقات تھے؟" ـــــ میں نے کہا۔

"وہ میں اس لیے مان رہی ہوں کہ آپ کہہ رہے ہیں" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "میرے پاس تو کوئی ثبوت نہیں جس پر اپنی بہو پر الزام تھوپ دوں۔"

"میرا خیال ہے کہ مقصودہ کی ماں کو بلا کر تمہارے سامنے بٹھا دینا ہوگا" ـــــ میں نے کہا ـــــ "تم نے اُسی کو کہا تھا کہ مقصودہ کو کہہ دے کہ اپنے خاوند کو خبردار کر دے۔ تمہیں اپنی عزت کا ذرا بھی خیال نہیں۔ اگر اپنے بیٹے کو پھانسی سے بچانا چاہتی ہو تو صحیح بات بتا دو۔"

"آپ کیا چاہتے ہیں؟" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "کیا میں یہ کہوں کہ ملک رحمت کو میرے بیٹے نے قتل کیا ہے؟ وہ آج دن کو قتل ہوا ہے نا! میرا بیٹا سارا دن گھر میں رہا ہے۔"

اس عورت نے مجھ کو تھوڑی دیر پریشان کیا۔ آخر اُس نے اپنی بہو صفیہ کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اُس نے پہلے اس لیے انکار کیا تھا کہ وہ ڈرتی تھی کہ میں اُس کے بیٹے کو قتل کے جرم میں گرفتار کر لوں گا۔ اُس نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ اُس کے بیٹے نے اور صفیہ کے بھائیوں نے کہا تھا کہ وہ ملک رحمت اللہ کو قتل کر دیں گے۔

"اگر یہ قتل کرنے والے ہوتے تو پہلے صفیہ کو قتل کرتے" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "صاف بات ہے جی! ملک رحمت صفیہ کی مرضی کے بغیر تو

تعلقات نہیں چلا رہا تھا۔ میری بہو کہاں کی شریف زادی ہے۔ میرے بیٹے نے تنگ آکر پندرہ سولہ دن گزرے اُس کو اپنے ماں باپ کے گھر بٹھا دیا ہے۔ وہ تو بڑی ڈھیٹ ہڈی کی بنی ہوئی ہے۔ میرے بیٹے نے اُس کو مارا پیٹا۔ اُس کے بھائیوں نے بھی اُس کی ہڈیاں توڑیں لیکن وہ باز نہیں آئی" —— اُس نے ایک ہی بار آدھی درجن قسمیں کھا کر کہا —— "میرے بیٹے نے ملک رحمت پر ہاتھ نہیں اُٹھایا نہ وہ سارا دن باہر نکلا ہے۔ میں نے تو بیٹے سے کہہ دیا ہے کہ اس بدچلن کو طلاق دے دو" —— اُس نے ہاتھ جوڑے پھر میری ٹھوڑی پکڑ کر کہا —— "ساری عمر تمہیں دُعائیں دوں گی۔ میرے بیٹے کو گرفتار نہ کرنا"

"خواہ مخواہ گرفتار کروں گا؟" —— میں نے کہا اور اُس کے دل سے کچھ اور باتیں نکلوانے کے واسطے میں نے اُس سے پوچھا —— "ملک رحمت کے علاوہ بھی تمہاری بہو کا کسی کے ساتھ تعلق ہے یا پہلے تھا؟"

"میں کسی ایک کا نام نہیں بتا سکتی" —— اُس نے جواب دیا —— "یہی بتا سکتی ہوں کہ اس عورت کا کوئی اعتبار نہیں"

"صفیہ کے بھائی کیسے آدمی ہیں؟"

"وہ تو شریف لوگ ہیں" —— اُس نے جواب دیا —— "اُن کی ماں بڑی ہوشیار عورت ہے۔ اُس کا خاوند شریف آدمی ہے۔ معلوم نہیں یہ لڑکی کس طرح اتنی آزاد ہو گئی تھی کہ کسی کے قابو میں نہیں آتی"

"تمہارے بیٹے کی کوئی اولاد ہے؟"

"نہیں" —— اُس نے جواب دیا —— "شادی کو چھ سال سے اوپر عرصہ ہو گیا ہے۔ اس بدچلنی کی وجہ سے گود ہری نہیں ہوئی"

میں نے اُس کو اُٹھا کر اُس کے بیٹے کو اندر بلایا۔

وہ جسم اور چہرے اور چال ڈھال سے مریض لگتا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس کو کیا تکلیف ہے تو اُس نے بتایا کہ چار ساڑھے چار سالوں سے اُس کو ہلکا ہلکا بخار رہتا ہے۔ بہت علاج کرائے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

"کیا اپنی بیوی کو طلاق دے رہے ہو؟" ــــ میں نے پوچھا۔
وہ آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔
"گھبراؤ نہیں بھائی میرے!" ــــ میں نے کہا ــــ "تمہاری بیوی کی شہرت سن چکا ہوں اور جو باتیں مجھ کو معلوم نہیں تھیں وہ تمہاری ماں بتا گئی ہے۔ میں نے پوچھا ہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے رہے ہو؟"
"طلاق ہی دینی پڑے گی" ــــ اس نے کہا۔
"اگر چار سال پہلے طلاق دے دیتے تو کیا اچھا نہیں تھا؟" ــــ میں نے کہا ــــ "کیا تمہاری بیوی شادی سے پہلے بھی اسی طرح بدنام تھی؟"
"اتنی تو نہیں تھی" ــــ اس نے جواب دیا ــــ "یا شاید ہمیں پتہ نہیں تھا۔ اب پتہ لگا ہے تو میں اس کو طلاق دے رہا ہوں"
"تو ملک رحمت کو ضرور قتل کرنا تھا؟" ــــ میں نے کہا۔
اس کو بڑی زور کا جھٹکا لگا۔ اس کی آنکھیں جو پہلے ہی مریضوں جیسی تھیں بالکل سفید ہوگئیں اور ایسا ہی رنگ اس کے چہرے کا ہوگیا۔ وہ تو غش کھانے لگا تھا۔ وہ کچھ کہنے لگا تو اس کے صرف ہونٹ ہلے۔ زبان نہ ہل سکی۔
"مرد بنو یار!" ــــ میں نے کہا ــــ "میں غیرت والے مردوں کی قدر کیا کرتا ہوں۔ پھانسی چڑھانا یا صاف نکال دینا میرے اختیار میں ہے..... تمہاری بیوی کے بھائی بھی تمہارے ساتھ تھے یا وہ اکیلے گئے تھے؟ بندوق تمہاری تھی یا اُن کی؟"
"میرے پاس بندوق نہیں جناب والا!" ــــ اس نے کہا ــــ "اُن کے پاس دونالی بندوق ہے، لیکن ہم پر جو آپ نے الزام لگایا ہے یہ بالکل غلط ہے۔"
"پھر سوچ لو" ــــ میں نے کہا ــــ "میں کہہ رہا ہوں کہ اس وقت معاملہ میرے ہاتھ میں ہے۔ موقعہ کا کوئی گواہ نہیں۔ مان جاؤ گے تو فائدے میں رہو گے۔"
اس کی حالت غیر ہوتی چلی گئی اور وہ انکار کرتا رہا۔ میں ہذر لیے

جرح اور سوالات اُس کے پیچھے پڑا رہا حتیٰ کہ اُس کے آنسو نکل آئے اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا کہ وہ پہلے ہی مر رہا ہے اور میں اُس کو اور زیادہ پریشان نہ کروں۔

"صفیہ کے بھائیوں کی بابت تمہارا کیا خیال ہے؟"

"وہ جانے اُن کا خدا جانے" ــــ اُس نے روتے ہوئے کہا ــــ "میں تو اُن کے واسطے قسم نہیں کھا سکتا۔ اُن کی بہن بدنام ہو کر گھر بیٹھ گئی ہے میں اپنی طرف سے اُن پر کوئی الزام نہیں لگاتا۔ انہوں نے اپنی بہن کو بہت مارا پیٹا تھا اور میرے آگے اُن کا سر نیچا رہا۔"

اس آدمی کی میں صحت دیکھتا تھا تو دل نہیں مانتا تھا کہ اس نے چار میل دُور جا کر کسی کو گولی ماری ہو گی۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ مقتول کے مرنے کا وقت دس ساڑھے دس بجے دن کا تھا۔ دن کے وقت کسی کو گولی مار کر بھاگ آنا اس آدمی کے بس کا کام نہیں تھا لیکن میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ بیمار آدمی میں قوّتِ برداشت نہیں ہوتی۔ ہو سکتا ہے اس سے برداشت نہ ہُوا ہو اور یہ مقتول کے قتل کے واسطے چل پڑا۔ اس کے خلاف اس وجہ سے بھی شک پختہ ہوتا تھا کہ چار ساڑھے چار سال سے مسلسل ہلکے بخار میں مبتلا تھا۔ بیوی بھی بے وفا نکلی۔ اس نے سوچا ہو گا کہ اس زندگی سے تو مر جانا ہی بہتر ہے اور اگر مرنا ہے تو اپنے دشمن کو بھی ساتھ ہی لے چلو۔

میں نے اس کو مشتبہ افراد کی فہرست میں رکھا اور باہر بٹھا دیا۔ صفیہ کے بڑے بھائی کو بلایا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ فوراً کہہ دیتا کہ ہاں، ملک رحمت کو میں نے گولی ماری ہے اور یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ قاتل یہی ہو۔ اس کے خلاف شک پختہ تھا اور شک کی وجوہات موجود تھیں۔ میں نے اُس کے ساتھ بھی اُسی طرح کی باتیں کیں جس طرح صفیہ کے خاوند کے ساتھ کی تھیں۔ اُس کو کہا کہ وہ قاتل ہے۔ اور وہ مان جائے اور میں اُس کی مدد کروں گا۔

آپ کو یہ بتا دوں کہ میں نے پولیس کی تفتیش کے انداز سے باتیں

کی تھیں۔ یہ اُستادی طریقہ ہوتا ہے جس کو عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ بعض اوقات کسی مشتبہ کے ساتھ اس طرح بات کی جاتی ہے جیسے تھانیدار بے چارہ سیدھا سادا اور بیوقوف آدمی ہے۔ بعض باتیں اس طرح کی جاتی ہیں جیسے چلتے چلتے کوئی غیر ضروری سی بات کہہ دی ہو۔

اس شخص کے ساتھ میں نے اسی طرح باتیں کیں۔ میں نے دیکھا کہ اس پر خوف اور گھبراہٹ نہیں تھی۔ اُس نے کہا کہ اُس کے پاس شکاری بندوق ہے۔ بندوق کو تو وہ نہیں چھپا سکتا تھا۔ یہ تھانے کے ریکارڈ میں لکھی ہوئی تھی لیکن اُس نے یہ نہیں مانا کہ وہ واردات کے روز بندوق لے کر کہیں باہر گیا تھا۔

اُس نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ اس کی بہن صفیہ کی درپردہ دوستی مقتول کے ساتھ تھی۔ اُس نے صفیہ کو مارا پیٹا بھی تھا۔

"وہ تمہاری بہن ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "میں اُس کی بابت کچھ ایسی باتیں پوچھوں گا جو تمہیں بہت بُری لگیں گی، لیکن میں نے تمہارے خلاف ایک شک صاف کرنا ہے۔ تھوڑی دیر کے واسطے بھول جاؤ کہ صفیہ تمہاری بہن ہے۔"

"آپ بات کریں" ــــ اُس نے کہا ــــ "آپ کو بالکل صحیح جواب ملے گا۔"

"کیا صفیہ شروع سے ایسی تھی؟" ــــ میں نے پوچھا ــــ "یعنی شادی سے پہلے بھی ..."

"نہیں جی!" ــــ اُس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا ــــ "اس کی عادتیں ذرا آزاد تھیں۔ ہنستی کھیلتی ذرا زیادہ تھی۔ اس میں یہ خرابی اب پیدا ہوئی تھی۔ ہم نہیں مانتے تھے لیکن یہ اتنی آزاد ہو گئی کہ ملک رحمت کے دفتر تک چلی جاتی تھی۔ اُس نے آڑھت کا دفتر ایسی جگہ بنایا ہوا ہے جو محلے کے ساتھ ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں دیکھ کر یقین کیا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"سات آٹھ مہینے ہو گئے ہیں" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "دراصل

بیماری لگی ہوئی ہے کہ اُس کے جسم میں نہ خون رہا ہے نہ دم رہا ہے۔ ہماری بہن نے چار پانچ سال برداشت کیا ہے۔۔۔۔ میں یہ نہیں کہتا کہ صفیہ نے جو کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔ مَیں آپ کو وجہ بتا رہا ہوں۔ بدکاری بدکاری ہی ہوتی ہے جناب! اُس کی وجہ چاہے کچھ ہی ہو۔۔۔۔

"پھر ملک رحمت، ہمارے اِس مریض بہنوئی کا ہمدرد بن گیا اور اس کے گھر آنے جانے لگا۔ اُس کو ملک رحمت بڑی دُور کسی حکیم کے پاس بھی لے گیا تھا۔ ہمارا بہنوئی غریب تو نہیں لیکن اُس کے علاج کا خرچ ملک رحمت دیتا رہا اور ہمارا بہنوئی خوش ہوتا رہا۔ اُس کو اتنی بھی سمجھ نہ آئی کہ ملک رحمت اُس کے گھر میں کیا جال پھینک رہا ہے۔ ہُوا یہ کہ صفیہ اُس کے جال میں آگئی اور ان کے غلط تعلقات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔"

"اس خرابی سے پہلے ہی تم اس وجہ سے طلاق لے لیتے کہ تمہارا بہنوئی بیمار ہے" ۔۔۔۔ مَیں نے کہا ۔۔۔ "وہ تو بیکار ہو چکا تھا۔"

اُس کی اور میری ان باتوں کا جو مَیں آپ کو سُنا رہا ہوں تفتیش کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ مَیں آپ کو اس مطلب کے لیے سُنا رہا ہوں کہ ہم لوگ کیسی کیسی غلطیاں کر کے گھروں میں خرابیاں پیدا کر لیتے ہیں صفیہ کے خاوند کو چاہیئے تھا کہ شادی کے کچھ عرصہ بعد وہ جسمانی طور پر معذور ہو گیا تھا تو بیوی کو طلاق دے دیتا اور اُس کی جوانی کو برباد نہ کرتا لیکن اس میں وہ اپنی بے عزتی سمجھتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اُس کی بیوی نے ایک غیر آدمی کے ساتھ تعلقات جوڑ کر خاوند کو لوگوں کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا۔

مَیں نے اُس کے بھائی سے پوچھا کہ اپنی بہن کو طلاق کیوں نہ دلا دی تو اُس نے بھی عزت اور غیرت کا نام لیا کہ طلاق سے بڑی بے عزتی ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنی عزت اور غیرت کو دیکھتے رہے اور نتیجہ یہ نکلا کہ ایک نوجوان عورت کی عصمت گئی اور ایک آدمی قتل ہو گیا۔
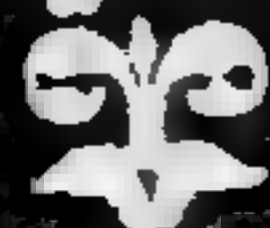
صفیہ کا بھائی مجھ کو قاتل نظر تو نہیں آتا تھا لیکن حالات انتہائی

بزدل اور انتہائی شریف آدمی کو بھی قاتل بنا دیا کرتے ہیں۔ اُس کے خلاف یہ شہادت بن سکتی تھی کہ قتل کے وقت وہ گھر سے بلکہ شہر سے غیر حاضر ہوتا. اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا تھا۔ پھر یہ شہادت درکار تھی کہ اس کو مقتول کی زمینوں کے علاقے میں بندوق کے ساتھ دیکھا گیا۔ یہ شہادتیں نہ ملنے کے باوجود میں اس شخص کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ وجہ موجود تھی جو اس کے خلاف شک پیدا کرتی تھی۔

اس کے بعد میں نے اس کے چھوٹے بھائی سے پوچھ گچھ کی۔ یہ بھی انکار کرتا تھا۔ اس کو اپنے بہنوئی اور اپنی بہن پر بہت غصہ تھا۔ میں نے اس کے بڑے بھائی سے بھی اور اس سے بھی اُس دھمکی کا پوچھا جو انہوں نے صفیہ کی ساس کے ذریعے مقصودہ کی ماں تک پہنچائی تھی۔

"ہاں جی!"۔۔۔ اس نوجوان نے کہا۔۔۔ "ایسی بات میں نے بھی کہی تھی اور میرے بہنوئی نے بھی کہی تھی لیکن ہم نے اس دھمکی پر عمل نہیں کیا اور عمل کرنے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ ہم میں اتنی جان نہیں کہ اتنے بڑے آدمی پر ہاتھ ڈال لیتے"

ان لوگوں میں اتنی جان تھی یا نہیں یہ تو ابھی میں نے دیکھنا تھا۔ سب سے پہلے تو مجھ کو ان کی بندوق کی ضرورت تھی۔ میری اپنی ضرورت یہ تھی کہ پوری رات گزر گئی تھی اور میں مشتبہوں کے ساتھ جھک جھک کر رہا تھا۔ کل کا دن جو گزرا تھا وہ آپ کو سنا چکا ہوں۔ مجھ کو تھوڑے سے آرام کی ضرورت تھی۔ صبح کے سات ساڑھے سات بجے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں اپنے گھر چلا گیا۔ نہا کر ناشتہ کیا اور تقریباً دو گھنٹے سو کر واپس آیا۔ صفیہ کے بھائیوں کو ساتھ لیا اور ان کے گھر کو روانہ ہو گیا۔ راستے میں وہ میری منتیں کرتے رہے کہ میں اُن کے گھر کی تلاشی نہ لوں۔

یہ خاص طور پر خیال رکھیں کہ یہ شہری لوگ تھے اور کچھ پڑھے لکھے بھی تھے اس وجہ سے یہ دیہاتیوں سے مختلف تھے۔ دیہات کے لوگ لڑائی مار کٹائی اور قتل سے نہیں ڈرتے۔ قتل کر کے فخر کرتے ہیں۔ شہری اپنی تہذیب کی وجہ سے برداشت کر لیتے ہیں۔

میں ان کے گھر چلا گیا اور محلے سے دو گواہ لے کر بندوق اُس طریقے سے برآمد کی جو قانون کے مطابق تھا۔ اُن کے گھر میں جتنے کارتوس تھے وہ بھی اپنے قبضے میں لے لیے۔ وہاں میں نے پہلی بار صفیہ کو دیکھا۔ کشش والی عورت تھی۔ سب سے بڑی کشش یہ تھی کہ وہ جوان تھی اور اُس کا رنگ ذرا صاف ستھرا تھا۔ وہ کوئی خاص طور پر خوبصورت عورت نہیں تھی۔ میں نے اُس کو الگ کمرے میں بٹھایا۔

"صفیہ!" ـــــ میں نے اُس کو کہا ـــــ "تمہارے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ مجھ کو سب معلوم ہو چکا ہے۔ تمہارے بھائیوں نے بھی بتا دیا ہے۔ تمہاری ساس اور خاوند کے بیان بھی لے چکا ہوں۔ تم اب کہو گی کہ یہ سب غلط ہے تو میں نہیں مانوں گا۔ اُلٹا تم خود پریشان ہو گی۔ ذرا سوچو کہ میں تمہیں تھانے لے جاؤں تو تمہاری جو ذرا سی عزت رہ گئی ہے وہ بھی جاتی رہے گی۔ تم انکار نہیں کر سکتیں کہ ملک رحمت اللہ کے ساتھ تمہاری خفیہ دوستی تھی۔ کہو کیا کہتی ہو؟"

اُس نے سر جھکا لیا اور بہت ہی آہستہ سے اقرار کیا کہ یہ بات ٹھیک ہے۔

"اب ایک اور سچی بات تمہارے آگے رکھتا ہوں" ـــــ میں نے جھوٹ بولا ـــــ "اس بات کو بھی جھٹلانا نہیں..... کل صبح تمہارے دونوں بھائی بندوق لے کر باہر نکل گئے تھے۔ تمہیں یہ تو پتہ نہیں ہو گا کہ باہر کون کون اُن کے ساتھ گیا تھا۔ مجھ کو یہ بتاؤ کہ وہ کس وقت واپس آئے تھے۔"

"کل صبح؟" ـــــ اُس نے حیران ہو کر کہا ـــــ "کل صبح وہ باہر نکلے ہی گے لیکن بندوق لے کر نہیں گئے۔"

"پھر یہ پرسوں صبح کی بات ہو گی!"

"میں یاد کر کے بتا سکتی ہوں کہ وہ کس وقت نکلے اور کس وقت واپس آئے" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "لیکن یہ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ وہ بندوق لے کر نہیں گئے..... اگر آپ کو یہ شک ہے کہ ملک رحمت کو میرے بھائیوں نے قتل کیا ہے تو یہ شک دل

سے نکال دیں۔"

"کیا تمہیں ملک رحمت کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں؟"___ میں نے پوچھا۔

"نہیں"___ اُس نے بڑی پختہ آواز میں جواب دیا___ "میں اُس کے جھانسے میں آگئی تھی۔ اُس نے میرے خاوند کی بیماری پر بہت خرچ کیا تھا۔ میں تو دعائیں مانگتی تھی کہ میرا خاوند ٹھیک ہو جائے۔ میں ملک رحمت کی باتوں میں آگئی اور اپنا آپ گنوا بیٹھی.... وہ بڑا گھٹیا آدمی تھا۔ مجھ کو اپنی عشق بازیاں سنایا کرتا تھا۔ آپ شاید یقین نہیں کریں گے کہ میں نے اُس کے ساتھ تعلق توڑ لیا تھا۔"

"کیا وجہ تھی؟"

"اُس نے اپنے زمینوں والے گاؤں کی کسی عورت کے ساتھ یارانہ گانٹھ لیا تھا"___ صفیہ نے جواب دیا___ "مجھ کو جب بھی ملتا اُس عورت کی باتیں سناتا کہ وہ کس طرح اس پر مرتی ہے۔ وہ کہتا تھا کہ اُس کے تین بھائی ہیں اور خاوند بھی ہے۔ یہ عورت اُن کی پرواہ نہیں کرتی۔ اُس نے مجھ کو یہ بھی بتایا تھا کہ ایک روز اس عورت کے بھائیوں نے اس کو دھمکی بھیجی تھی کہ وہ اپنی زمین کی حدود سے باہر قدم نہ رکھے ورنہ مارا جائیگا۔"

"کیا تم نے اس بات کو سچ مان لیا تھا؟"

"میں کیا بتا سکتی ہوں کہ یہ سچ تھا یا جھوٹ!"___ اُس نے جواب دیا___ "وہ اس عورت کی باتیں ایسے طریقے سے سناتا تھا جیسے مجھ کو اُس کے مقابلے میں کچھ بھی نہ سمجھتا ہو۔ میں اس کے بعد اُس کو نہیں ملی۔"

"ملک رحمت کب تک تمہارے خاوند کے پاس آتا رہا ہے؟"

"میں نے جب اس کے ساتھ تعلق توڑ لیا اس سے مہینہ پہلے تک آتا رہا"___ صفیہ نے جواب دیا___ "پھر اُس نے وہاں آنا چھوڑ دیا جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے خاوند کو اور میرے بھائیوں کو ہمارے تعلقات کا پتہ لگ گیا تھا۔ میں نے اُس کو کہا تھا کہ وہ میرے گھر میں نہ آیا کرے۔"

"تم نے ایک بات سچ بتا دی ہے"___ میں نے کہا___ "اب کوئی

پردہ نہ رہنے دو۔ ملک رحمت اللہ کے علاوہ تمہارے تعلقات کس کے ساتھ تھے؟"

"اور کوئی نہیں تھا" — اُس نے جواب دیا اور مجھ کو یہ یقین دلانے کے واسطے کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہے اُس نے بہت کچھ کہا۔

اُس کی زبان سے میں اُس کے بھائیوں کے خلاف کوئی بات نہیں اُگلوا سکتا تھا۔ میں بندوق، کارتوس اور اس کے بھائیوں کو ساتھ لے کر تھانے چلا گیا۔

میں نے اُس گاؤں کے نمبردار کو اور مخبروں کو تھانے لانے کے لیے ایک کانسٹیبل کو بھیجا۔ صفیہ نے ایک اشارہ دیا تھا قتل تو دراصل دیہات کے لوگ کیا کرتے تھے۔ شہر کے مخبر آئے ہوئے تھے۔ میں نے اُن سے رپورٹیں لینی شروع کیں۔ ان سے مجھ کو کوئی نئی بات معلوم نہ ہوئی۔ مقتول کی بابت وہی کچھ معلوم ہوا جو مجھ کو پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا۔ صفیہ کی بابت بھی کچھ اور پتہ نہ لگا۔ کئی گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔ پھر اُس گاؤں کا نمبردار اور دو اور آدمی آگئے۔ میں نے نمبردار کو اپنے پاس بٹھایا اور مقتول کی بابت پوچھا۔

"حضور میں تو خود آنے لگا تھا" — نمبردار نے کہا — "میں اس وجہ سے پہلے نہ آیا کہ شاید آپ کو اصل مجرم مل گیا ہے۔"

"کچھ بھی نہیں ملا چوہدری!"

"پھر میری ایک بات پر غور کریں" — نمبردار نے کہا — "میرے گاؤں کی ایک جوان عورت ملک رحمت کے پاس اُس کے زمینوں والے مکان میں جایا کرتی تھی۔ یہ بات تو ملک کے مزارعوں کو بھی معلوم ہے۔ ملک میرے گاؤں میں پہلے پہل آتا رہا تھا۔ پھر اُس نے آنا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں اُس کو اُس عورت کے ساتھ اُونچی فصلوں کے درمیان بنڈھ پر کھڑے باتیں کرتے دیکھا ہے۔ اس میں کوئی شک شبہ نہیں کہ ان کے آپس کے تعلقات تھے۔ پھر میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ ملک رحمت

نے میرے گاؤں میں آنا کیوں چھوڑا تھا .... اس عورت کے بھائیوں کو اپنی بہن کی کرتوت کی خبر ہو گئی تھی اور وہ اس عورت کے خاوند کے ساتھ مل کر ملک کو مارنے پیٹنے کے لیے تیار ہو گئے تھے لیکن ملک کے ایک مزارع نے اُس کو پہلے خبردار کر دیا تھا"۔

"کیا ان لوگوں کے پاس شکاری بندوق ہے؟"

"ہاں جی!"___ اُس نے جواب دیا___"ان کے پاس بارہ بور کی دونالی بندوق ہے.... انہوں نے اپنی بہن کو مار مار کر بیہوش کر دیا تھا پھر اس کا گاؤں میں سے باہر جانا بھی بند کیا ہوا تھا"۔

"میں حیران ہوں چوہدری!"___ میں نے کہا___"یہ ملک بوڑھا ہو گیا تھا، پھر بھی عورت بازی سے باز نہیں آیا تھا"۔

"یہ شراب کی طاقت تھی جناب!"___ اُس نے کہا___"پھر پیسے کی طاقت تھی"۔

"پھر کیا ہوا؟"

"اب ضروری بات سُنیں"___ اُس نے کہا___"اس عورت کے خاوند کا ایک بھائی فوج میں حوالدار ہے۔ میں نے پرسوں شام اُس کو گاؤں میں دیکھا تھا۔ اس کے بعد نظر نہیں آیا"۔

"کیا وہ چھٹی آیا تھا؟"___ میں نے پوچھا___"تم اُسے ملے ہو گے؟"

"نہیں"___ اُس نے جواب دیا___"میں اُس کو نہیں ملا۔ وجہ یہ ہے کہ میرے خاندان کی اُس خاندان کے ساتھ بول چال بوجہ عداوت بند ہے۔ بڑا تیز اور لٹھ باز خاندان ہے۔ وہ ایسے ویسے لوگ نہیں۔ میں نے پتہ لگایا تھا کہ یہ کب آیا ہے اور کتنی چھٹی آیا ہے۔ مجھ کو بتایا گیا کہ پرسوں صبح آیا تھا۔ یہ بھی پتہ لگا کہ اُس کے پاس کوئی سامان نہیں تھا....

"ایک بات یہ سامنے رکھ لیں کہ کل صبح اس عورت کا ایک بھائی اپنے ایک دوست کے ساتھ بندوق لے کر شکار کے واسطے گیا تھا اور وہ دونوں واپس آئے تو اس کے کچھ دیر بعد گاؤں میں خبر آ گئی کہ ملک رحمت اللہ فلاں جگہ مارا گیا ہے۔ میں اس وجہ سے آپ کے پاس نہ آیا کہ یہ علاقہ دوسری

نمبرداری ہی ہے۔ وہ نمبردار اس وجہ سے آپ کے پاس نہیں آیا کہ وہ بڑے بخار میں بڑی بُری حالت میں گر پڑا ہے۔ مجھ کو سب سے پہلا شک یہ ہُوا کہ اس عورت کا بھائی ملک سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے آیا ہے۔"

نمبردار نے بہت ساری تفصیلات بھی سنائی تھیں۔ مختصر یہ کہ اُس نے مجھ کو ایک اور کھوج پر ڈال دیا۔ اس نمبردار کے خلاف بھی ایک شک پیدا ہوتا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ اس عورت کے خاندان کے ساتھ اُس کی خاندانی دشمنی ہے اس وجہ سے مجھ کو شک ہُوا کہ یہ اُن کے خلاف بڑھا چڑھا کر رپورٹ دے رہا ہے۔ بہرحال مجھ کو ایک سُراغ مل گیا تھا۔ میں فوراً اس سُراغ پر دوڑ پڑا۔ اپنا ضروری عملہ ساتھ لیا اور نمبردار کے گاؤں چلا گیا اور سیدھا اس عورت کے بھائیوں کے دروازے پر جا رُکا۔ دونوں بھائی گھر پر ہی تھے۔ جونہی وہ باہر نکلے میں اُن کو دھکیل کر اندر چلا گیا اور اُن کو کہا کہ اپنی بندوق میرے حوالے کر دیں۔

اُنہوں نے دو گواہوں کی موجودگی میں بندوق برآمد کر دی اور میں نے کارتوس بھی اپنے قبضے میں لے لیے۔

"یہ بندوق کب چلائی تھی؟" ـــــ میں نے اُن کے گھر میں کھڑے کھڑے پوچھا۔

"کل صبح" ـــــ ایک بھائی نے جواب دیا ـــــ "میں شکار پر گیا تھا۔ پندرہ سولہ پرندے ملے تھے۔"

"اور وہ جو بڑا موٹا شکار کیا ہے" ـــــ میں نے کہا۔

"نہیں حضور!" ـــــ اُس نے انجان بنتے ہوئے جواب دیا ـــــ شکار کے واسطے تو بہت آگے جانا پڑتا ہے۔ ہم زیادہ دور نہیں گئے تھے۔"

"جو موٹا شکار تم نے کیا ہے وہ تو یہاں بالکل قریب ہی تم کو مل گیا تھا" ـــــ میں نے کہا اور اُس کے قریب ہو کر اُس کے کان میں آہستہ سے کہا ـــــ "میں ملک رحمت کی بات کر رہا ہوں۔"

وہ اس طرح پیچھے ہٹا جیسے میں نے اُس پر حملہ کرنے کی خاطر خنجر نکال لیا ہو۔ اُس نے نمبردار کی طرف دیکھا جو ہمارے قریب ہی کھڑا تھا۔

"نمبردار!" ـــ اس نے دانت پیس کر نمبردار کو کہا ـــ "دشمنی میدان
میں نکل کر کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے پوری کی جاتی ہے۔ تم نے تھانے
میں جا کر یہ جھک ماری ہے کہ ملک رحمت کو میں نے گولی ماری ہے۔
لعنت ہے تیری مردانگی پر۔ مرد اوچھا وار نہیں کیا کرتے۔"

"تم میرے ساتھ بات کرو یار!" ـــ میں نے کہا ـــ "مجھ کو معلوم
ہے کہ نمبردار کے ساتھ تمہاری دشمنی ہے۔ میں اب اس کی نہیں تمہاری
بات سنوں گا۔ میرے ساتھ سچ بولو گے تو میں تمہارا دوست بن جاؤں گا۔"

"چوہدری!" ـــ دوسرے بھائی نے نمبردار کو کہا ـــ "ہم تیرے
اس وار کا جواب میدان میں دیں گے۔ ہم ذرا پولیس سے بھگت لیں۔"

وہاں نمبردار کے ایک دو رشتہ دار بھی موجود تھے۔ انہوں نے
ان دونوں بھائیوں کی للکار کا جواب دیا۔ اگر میں موجود نہ ہوتا تو ان
کا آپس میں خون خرابہ ہو جاتا۔ میں ان دونوں بھائیوں کو، ان کے بہنوئی
کو اور ان کی مطلقہ بہن کو ساتھ لے کر گاؤں سے آ گیا۔ راستے میں مقتول
کی زمینوں سے گزرا اور کچھ دیر وہاں رکا۔ وہاں چار مزارعے موجود تھے
ان سب کو اکٹھا کر لیا اور ان سے پوچھا کہ یہ عورت یہاں آتی تھی اور
مقتول کو ملتی تھی یا نہیں۔ پہلے تو وہ سب گھبرائے ـــ پھر میرے رعب
اور حوصلہ افزائی سے انہوں نے اقرار کر لیا۔ میں نے ان کو بھی تھانے
لے جانے کے واسطے اپنے ساتھ لے لیا۔

سب سے پہلے اس بھائی کو اپنے دفتر میں بٹھایا جو شکار پر گیا
تھا۔ اس کے ساتھ جو دوست گیا تھا میں اس کو بھی ساتھ لے آیا تھا۔

"دیکھو میرے دوست!" ـــ میں نے عورت کے اس بھائی کو کہا ـــ
"مجھ کو اور اپنے آپ کو تنگ کر کے جو بات بتاؤ گے وہ ابھی بتا دو۔ اس
میں تمہارا ہی بھلا ہے۔"

"کیا بتا دوں؟"

"یہ کہ ملک رحمت کو تم نے گولی ماری ہے" ـــ میں نے کہا ـــ

"میں نہ خود ہیر پھیر کروں گا نہ تمہیں کرنے دوں گا۔"

"حضور!" ـــ اُس نے کہا ـــ "آپ نے دیکھ لیا ہے کہ نمبردار کے ساتھ ہماری خاندانی دُشمنی ہے۔ ہمیں خراب کرنے کا اُس کو بڑا اچھا موقع مل گیا ہے۔"

"کیا تمہاری بہن کے تعلقات ملک رحمت کے ساتھ نہیں تھے؟" ـــ میں نے پُوچھا ـــ "کیا تم نے اپنی بہن کو ملک رحمت کے پاس جاتے نہیں پکڑا تھا؟ کیا تم نے اپنی بہن کو مار مار کر بے ہوش نہیں کر دیا تھا؟"

"ہاں حضور!" ـــ اُس نے کہا ـــ "یہ سب درست ہے۔ میں سچ کو سچ ہی کہوں گا لیکن میں ملک رحمت کا قاتل نہیں۔"

"آدھی رات سے پہلے پہلے تم اپنی زبان سے کہو گے کہ تم قاتل ہو" ـــ میں نے کہا ـــ "اگر تم نہیں تو تمہارے بہنوئی کا بھائی جو فوج میں حوالدار ہے وہ یہ کام کر گیا ہے.... وہ کتنی چھٹی آیا تھا؟"

"کون سا حوالدار؟" ـــ اُس نے حیران ہو کر کہا ـــ "وہ تو نہیں آیا۔"

"کیا وہ پرسوں یہاں نہیں تھا؟"

"نہ جی!" ـــ اُس نے کہا ـــ "آپ کو کس نے بتایا ہے؟"

نمبردار اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ میں اپنے کمرے سے نکلا اور نمبردار کو الگ کر کے کہا کہ یہ شخص کہہ رہا ہے کہ اس کے بہنوئی کا بھائی حوالدار نہیں آیا تھا۔ نمبردار نے کہا کہ میں چاہوں تو وہ اُن آدمیوں کو گاؤں جا کر تھانے لے آتا ہے جنہوں نے حوالدار کو دیکھا تھا۔

"چوہدری!" ـــ میں نے اُس کو تھانیداروں کے رُعب سے کہا ـــ "یہ جھوٹ نکلا تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔"

"پھر چھوٹے تھانیدار صاحب کو یا اپنے کسی حوالدار کو گاؤں بھیج کر معلوم کرائیں" ـــ اُس نے کہا ـــ "اب تو مجھ کو اپنا سچ ثابت کرنا ہی پڑے گا۔"

میں نے اُس کو گاؤں نہ جانے دیا۔ مجھ کو ایک خیال آگیا۔ میں نے اِس عورت کے دوسرے بھائی کو باہر ہی الگ کر کے پوچھا کہ وہ حوالدار کتنی چھٹی آیا تھا۔ اُس نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں نے ان کی بہن کو بلایا اور پوچھا تو اُس نے ایسے لہجے میں انکار کیا جس سے مجھ کو پکا شک ہو گیا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

میں نے دونوں بھائیوں کو اُن کی بہن کے پاس بلایا۔ اس عورت کے خاوند کو بھی بلایا۔

"تم چاروں میرے سامنے آپس میں مشورہ کر کے مجھ کو بتاؤ کہ ان کا حوالدار پرسوں گاؤں میں تھا یا نہیں" ـــــ میں نے اُن کو کہا ـــــ "اِس عورت کے ساتھ تھانے میں جو سلوک ہو گا وہ کل صبح اِس سے پوچھ لینا لیکن اِس کے منہ سے بات نہیں نکلے گی۔ انکار کرو۔ میں تمہارے خاندان کے بچے سے بوڑھے تک کو، مردوں اور عورتوں تک کو تھانے بلا لوں گا۔"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آپس میں انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ آنکھوں آنکھوں میں فیصلہ کر لیا۔

"ہمارے انکار کی ایک وجہ ہے جناب!" ـــــ اس عورت کے خاوند نے کہا ـــــ "حوالدار میرا بھائی ہے۔ وہ بغیر چھٹی کے آیا تھا۔ ایک صبح آیا اور اگلے روز چلا گیا تھا۔ وہ قریب ہی چھاؤنی میں ہوتا ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ کسی کو بتانا نہیں۔"

آپ نے محترم احمد یار خان کی کہانیوں میں پڑھا ہو گا۔ ایک فوجی بغیر چھٹی کے اپنے گاؤں آیا اور اپنے کسی دشمن کو قتل کر کے چلا گیا۔ اُس کی رجمنٹ میں پولیس اُس کی گرفتاری کے واسطے گئی تو اُس کے افسروں نے کہا کہ وہ ڈیوٹی پر تھا۔ گاؤں تک کس طرح جا سکتا تھا۔ اس طرح اُس کو بچا لیا گیا۔

اس کیس میں بھی مجھ کو شک ہو گیا تھا کہ یہ حوالدار ملک رحمت اللہ کو قتل کرنے آیا تھا اور اُس کو موقع مل گیا۔ اُس نے مقتول پر کارتوس چلایا اور واپس اپنی چھاؤنی میں چلا گیا۔ یہ اِس طرح ہوا ہو گا کہ اس عورت

کا بھائی شکار کے بہانے بندوق اور ایک دوست کو لے کر گاؤں سے
نکلا۔ حوالدار گاؤں سے کہیں دور کھڑا ہو گا۔ اُس نے بندوق لی اور ملک
رحمت اللہ کو دیکھنے لگا۔ ملک رحمت اللہ کی موت اُس کو بڑی موزوں جگہ
لے گئی۔ میں جانتا تھا کہ میں چھاؤنی جا کر اُس کی رجمنٹ میں گیا تو مجھ کو
کہا جائے گا کہ یہ حوالدار تو فلاں ڈیوٹی پر اپنی رجمنٹ میں موجود تھا لیکن
پہلے تو میں نے یہ معلوم کرنا تھا کہ حوالدار ان دونوں شکاریوں کو راستے
میں ملا تھا یا نہیں۔

میں نے اُس عورت کے بھائی سے جس کو میں نے پہلے اپنے کمرے
میں بٹھایا تھا، پوچھا کہ اُس کے ساتھ شکار پر کون گیا تھا۔ اُس نے
نام بتایا تو میں نے ایک کانسٹیبل کو بھیجا کہ اُس کو گاؤں سے لے آئے۔
اُس کے آنے تک میں نے اس عورت کو اپنے کمرے میں بٹھایا اور پوچھ
گچھ کرنے لگا۔ صفیہ کی طرح اُس نے بھی مقتول کے ساتھ اپنے تعلقات
کو تسلیم کر لیا۔

اس کے چال چلن کی رپورٹ جو مجھ کو ملی تھی وہ اچھی نہیں تھی میں
نے اس سے بہت ساری باتیں پوچھیں لیکن اُس پر تھانیداروں والا
رُعب نہیں ڈالا۔ صفیہ نے کہا تھا کہ اُس کے بھائیوں نے ملک رحمت کو
قتل نہیں کیا لیکن یہ عورت کہتی تھی کہ وہ اپنے بھائیوں اور خاوند کی جگہ قسم
نہیں کھا سکتی۔ انہوں نے قتل کیا ہو گا۔

میری تفتیش کے دباؤ میں آ کر اُس نے یہ بھی بتا دیا کہ ملک رحمت
سے پہلے اُس نے اسی طرح کی دوستی گاؤں کے ایک اور آدمی کے
ساتھ لگائی تھی۔ اُس نے ملک رحمت کو دوست بنا لیا تو پہلے دوست
نے اُس کو دو تین بار کہا تھا کہ وہ ملک رحمت کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

یہ تو کہنے کی بات ہوتی ہے۔ دھتکارے ہوئے عاشق اس طرح
کی دھمکیاں اکثر دیا کرتے ہیں لیکن میں نے اس شخص کو بھی مشتبہ فہرست
میں شامل کر لیا۔ میرا پختہ شک اس عورت کے بھائیوں اور خاوند پر تھا۔
میں نے ان کو دیکھ کر بھی کہا کہ دلیر آدمی ہیں۔ انہوں نے میری موجودگی

میں جس طرح نمبردار کو للکارا اور اُس کو دھمکی دی تھی اس طرح ہر کوئی نہیں کر سکتا۔

اس عورت سے مجھ کو ایک نئے مشتبہ کے سوا کچھ نہ ملا۔ میں نے اُس سے اُس کے خاوند کے بھائی حوالدار کی بابت پوچھا تو اُس نے بتایا کہ اس نے سنا تھا کہ وہ آیا ہے لیکن وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں تھی اس وجہ سے اُس نے حوالدار کو نہیں دیکھا۔ اگلی صبح اس عورت کا بھائی گھر والوں کو یہ بتا کر کہ وہ شکار پر جا رہا ہے، بندوق لے کر نکل گیا۔

"وہ واپس کس وقت آیا تھا؟"

اُس نے جو وقت بتایا وہ ملک رحمت کے قتل کے وقت سے دو گھنٹے بعد کا تھا۔ اب میں نے وقت کا حساب جوڑ کر ملزم کا سراغ لگانا تھا مثلاً اس طرح کہ اس عورت کا یہ بھائی جو شکار کو گیا تھا، کس وقت اُس جگہ سے گزرا جہاں ملک رحمت قتل ہوا تھا۔

جب وہ آدمی آیا جو اس عورت کے بھائی کے ساتھ شکار پر گیا تھا تو میں نے اُس کو دم نہ لینے دیا۔ اپنے دفتر میں لے گیا اور بنچ پر بٹھا دیا۔

"دیکھ جوان!" ___ میں نے کہا ___ "تمہیں پتہ لگ گیا ہو گا کہ میں نے کس کس کو تھانے بٹھایا ہوا ہے۔ ان سب کے بیان لے چکا ہوں۔ تم نے ذرا سا بھی جھوٹ بولا تو میں تمہیں حوالات میں بند کر دوں گا" ___ میرے ہاتھ میں بید کا ڈنڈا تھا اور میں اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا ___ "تم اُس کے ساتھ شکار پر گئے تھے۔ راستے میں تمہیں حوالدار کہاں ملا تھا؟"

"نہیں حضور!" ___ اُس نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا ___ "ہمیں راستے میں کوئی حوالدار نہیں ملا تھا"۔

"ایک جھوٹ!" ___ میں نے کہا ___ "تم واپسی پر اُس جگہ سے کس وقت گزرے تھے جہاں ملک رحمت کی لاش پڑی تھی؟ تم نے وہ

جگہ دیکھی ہو گی۔"

"میں نے خود نہیں دیکھی" ___ اُس نے کہا ___ "لوگوں نے بتایا تھا۔ میں اُس جگہ کو جانتا ہوں.... اور جناب! ہم واپسی پر اُس جگہ سے نہیں گزرے تھے۔ ہم دوسرے راستے سے آئے تھے۔"

اُس زمانے میں ایک اور مشکل تھی۔ آج کل جس کو دیکھو اُس نے گھڑی باندھی ہوئی ہوتی ہے۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں اُس وقت شہروں میں بھی بہت کم لوگوں کے پاس گھڑیاں ہُوا کرتی تھیں۔ دیہات میں تو کسی فوجی کے پاس ہی گھڑی ہوتی تھی۔ بڑے امیر زمینداروں کے پاس بھی گھڑی نہیں ہوتی تھی۔ یہ ایسی مشکل تھی کہ مَیں وقت کا حساب نہیں کر سکتا تھا کہ فلاں جگہ سے فلاں آدمی کس وقت گزرا تھا۔ میں نے اندازے اور موٹے حساب پر بھروسہ کیا۔

مَیں نے جس آدمی کو اپنے سامنے بٹھایا ہُوا تھا، وہ یہ نہیں مان رہا تھا کہ ان دونوں کو راستے میں حوالدار ملا تھا اور وہ میرے رُعب اور تھوڑے سے تشدد کے باوجود نہیں مانتا تھا کہ وہ جائے واردات کے قریب سے گزرے تھے۔

"میرا خیال ہے تم ان دونوں بھائیوں اور ان کے بہنوئی اور اُس کے حوالدار بھائی کی پھانسی کا پھندہ اپنے گلے میں ڈالنا چاہتے ہو" ___ میں نے کہا ___ "دوستی کا یہ حق جو تم ادا کر رہے ہو تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔"

"جناب عالی!" ___ اُس نے پختہ آواز میں کہا ___ "ملک رحمت کا قاتل کوئی بھی ہو، مَیں آپ کو یہ بتا رہا ہوں کہ اُس عورت کا ایک بھائی میرے ساتھ تھا اور بندوق اُس کے پاس تھی۔ اگر اُس کے دوسرے بھائی نے کسی اور کی بندوق لے کر ملک رحمت کو مار ڈالا ہو تو وہ میں نہیں جانتا۔"

"تم اُس کے دوست تھے" ___ مَیں نے پوچھا ___ "کیا یہ دونوں بھائی ملک رحمت کے قتل کی باتیں کیا کرتے تھے؟"

"ہاں جی!" ـــ اُس نے جواب دیا ـــ "کیا کرتے تھے لیکن وہ صرف باتیں ہی کرتے تھے۔"

میں اُس کو صرف ایک جگہ چکر دے رہا تھا، یعنی حوالدار راستے میں ان کے ساتھ ہو گیا تھا اور اس نے ملک رحمت پر کارتوس چلایا تھا۔ وہ آتنا زیادہ تنگ آ گیا کہ اُس کے آنسو نکل آئے۔ میں اُس کو گالیاں دے رہا تھا اور اُس کے ساتھ میرا باقی رویہ بھی شریفوں والا نہیں تھا۔

ایک اور بات کا بیان ضروری ہے۔ میں نے اس کہانی میں مقتول کی جوان بیوہ مقصودہ کو تفتیش سے خارج نہیں کیا تھا۔ اُس پر میرا شک پہلے کی طرح قائم تھا۔ مخبروں نے اور اُس کے محلّے کے دو معززین نے اُس کا چال چلن ٹھیک بتایا تھا اور کہا تھا کہ وہ اتنی چالاک اور ہوشیار لڑکی نہیں کہ اپنے کسی آشنا کے ساتھ مل کر اُس نے اپنے خاوند کو قتل کرا دیا ہو۔ میرے کہنے پر مخبر اس ٹوہ میں لگے ہوئے تھے کہ مقصودہ کی کسی کے ساتھ آشنائی تھی یا نہیں۔

شہر کے مریض خاوند کی بیوی صفیہ کے دو بھائیوں کو بھی مشتبہ بٹھایا ہوا تھا۔ اُن کی بندوق اور گاؤں سے برآمد کی ہوئی بندوق ایگزامینر کے معائنے کے واسطے بھجوا دی تھیں۔ یہ اس قصبے سے پچاس میل دُور کے بڑے شہر میں گئی تھیں۔ ان کی رپورٹیں دو دن بعد آنی تھیں۔

میں گاؤں کے اس جوان آدمی کو تفتیش کی چکی میں رگڑ رہا تھا اور وہ رونے پر آ گیا۔ اچانک اُس کی آنکھیں ٹھہر گئیں اور وہ کچھ سوچنے لگا۔ اُس نے میری طرف دیکھا۔

"آپ نے میرے ساتھ بلاوجہ ایسا سلوک کیا کہ میرا دماغ میرے قابو سے نکل گیا ہے" ـــ اُس نے کہا ـــ "اگر آپ قتل کا الزام زبردستی ہم پر تھوپنا چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی ہے۔ میں آپ کو دو باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ اِن پر غور کریں۔"

"میری تمہارے ساتھ کوئی دشمنی نہیں" ـــ میں نے کہا ـــ "تمہارے

دل میں جتنی باتیں آتی ہیں وہ سب کرو۔"

"ہمارے گاؤں سے کچھ دُور سبزیوں کا چھوٹا سا ایک باغ ہے" — اُس نے کہا — "وہاں رہٹ لگا ہُوا ہے۔ ہم واپسی پر وہاں رُکے تھے۔ ہم جب بھی اُدھر جاتے ہیں وہاں ضرور رُکتے ہیں۔ پانی پیتے ہیں اور باغ کے مالک کے پاس تھوڑی دیر بیٹھتے ہیں۔ آپ اُس سے پوچھیں کہ ہمارے ساتھ اور کون تھا اور اُس سے اُٹھ کر ہم کدھر گئے تھے۔ وہاں سے ہمارے گاؤں کا راستہ دوسرا ہے۔۔۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے آپ کے اس شہر کے دو آدمی اُس علاقے میں پرندوں کا شکار کرتے دیکھے تھے۔"

"انہیں شناخت کر سکتے ہو؟" — میں نے پوچھا۔

"ایک کو پہچانتا ہوں" — اُس نے جواب دیا — "آپ کے شہر کے مشہور آدمی کا بیٹا ہے۔۔۔ خواجہ قدیر کا بیٹا شبیر جو اپنے باپ سے زیادہ مشہور ہو گیا ہے۔ اُس کے ساتھ اُس کی عمر کا ایک اور جوان آدمی تھا۔ میں اُس کو نہیں جانتا۔"

"اُن کے ساتھ تمہاری بات چیت ہُوئی تھی؟"

"وہ اتنے قریب نہیں آئے تھے" — اُس نے جواب دیا — "اور بہت دُور بھی نہیں تھے۔ ہم نے اُن کو دیکھا تھا۔ ہم تو اپنے گاؤں کی طرف آ گئے اور وہ درختوں پر پرندے دیکھتے اُدھر کو جا رہے تھے جدھر ملک رحمت کی زمینیں اور اُس کا مکان ہے اور ملک رحمت جہاں مارا گیا ہے۔ انہوں نے چار یا پانچ کارتوس چلائے تھے۔ پھر دُور سے ہم نے اُن کے کارتوس کی آواز سُنی تھی۔"

پہلے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ خواجہ قدیر کون اور کیا تھا۔ آپ نے بڑے شہروں کے محلّوں میں اور قصبوں میں بعض آدمی دیکھے ہوں گے جن کو "ہر دیگ کا چمچہ" کہا جاتا ہے۔ وہ مسجد کمیٹی کے کرتا دھرتا ہوتے ہیں۔ عید میلاد کے جلوس کا انتظام کرتے ہیں۔ کوئی انجمن یا تنظیم ہو تو اُس کا ... تو میں نے اُس طرف دیکھا۔ اب مجھ کو یاد آتا ہے کہ یہ درخت ذرا گہری

جگہ تھے جن پہ فاختائیں جا بیٹھی تھیں۔ میں نے اشفاق کو دیکھا۔ وہ بہت تیز چلتا آ رہا تھا۔ میں نے دور سے ہی اُس کو کہا کہ کارتوس ضائع کر آئے ہو۔ اُس نے میرے قریب آ کر بھی جواب نہ دیا۔ میں نے پھر پوچھا کہ کوئی فاختہ نہیں مری، تب اُس نے کہا کہ اُڑ گئی ہیں۔ پھر کہنے لگا کہ چلو چلیں۔ وہ بہت ہی گھبرایا ہوا تھا بلکہ ڈرا ہوا تھا جیسے اُس نے کوئی ڈراؤنی چیز دیکھ لی ہو مجھ کو اب یاد آتا ہے کہ اُس کے چہرے کا رنگ بھی کچھ عجیب سا ہو گیا تھا۔ میں اُس سے پوچھتا رہا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے تو وہ کوئی جواب نہیں دیتا تھا....

"میں اُٹھا اور اُس کے ساتھ چل پڑا۔ اُس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی اور وہ بار بار کہتا تھا کہ تیز چلو۔ ہم سیدھے راستے پر جا رہے تھے تو اُس نے کہا کہ چلو اُدھر سے چلتے ہیں۔ وہ مجھ کو ایک اوٹ ہی طرف لے گیا۔ میں آخر رُک گیا۔ اُس کا بازو پکڑ کر اُس کو بھی روکا اور پوچھا کہ اُس کو ہو کیا گیا ہے"

شبیر کا اتنا ہی بیان سُن کر مجھ کو یقین ہو گیا کہ ملک رحمت کا قاتل اشفاق ہے۔ وہ اپنے دوست کو تو نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ کیا کر آیا ہے لیکن اس کا دوست اُس کے پیچھے پڑ گیا کہ اُس کو کیا ہو گیا ہے۔

"یار تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟" ــــ اشفاق نے شبیر کو بتایا ــــ "وہ جگہ آسیبی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے ایک فاختہ کو ایک شاخ پر بیٹھے دیکھ کر شست میں لیا تو فاختہ اُڑی نہیں بلکہ وہیں غائب ہو گئی۔ وہ پھر مجھ دے۔ دوسروں کا پھندہ اپنے گلے میں نہ ڈالے۔"

خواجہ قدیر اپنے آپ کو بڑی اُونچی حیثیت کا آدمی سمجھتے ہوئے بیٹھ گیا، اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں اُس کے بیٹے سے کیا پوچھوں گا۔ میں نے اُس کو روکھے سے لہجے میں اُٹھنے اور باہر نکل جانے کو کہا۔ اس سے وہ اور زیادہ گھبرایا۔ میں نے اُس کو باہر نکال دیا اور اُس کے بیٹے کو بٹھایا۔

"کل تم کسی کے ساتھ اُس طرف شکار کے واسطے گئے تھے جدھر ملک رحمت اللہ کی زمینیں ہیں؟" ــــ میں نے اُس سے پوچھا۔

"ہاں جی!" ــــ اُس نے بلا جھجک جواب دیا ــــ "میں گیا تھا۔ میرے ساتھ ایک دوست بھی تھا۔"

"کون تھا وہ؟"

"اُس کا نام اشفاق ہے" ــــ اُس نے جواب ــــ "بڑے اچھے خاندان کا آدمی ہے۔"

میں اشفاق کے نام پر چونکا۔ مجھ کو ویسے ہی خیال آیا کہ یہ وہی اشفاق تو نہیں۔

"یہ وہی اشفاق تو نہیں جس کا کوئی دو سال پہلے ملک رحمت اللہ کے گھر میں کچھ چکر چلا تھا؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"ہاں ہاں" ــــ شبیر نے جواب دیا ــــ "یہ وہی اشفاق ہے۔"

"شبیر بھائی!" ــــ میں نے پوچھا ــــ "وہ چکر کیا تھا؟ اشفاق تمہارا دوست ہے۔ اُس نے تمہیں کچھ بتایا ہوگا۔"

"اُس نے مجھے کچھ نہیں بتایا" ــــ شبیر نے جواب دیا ــــ "مشہور یہ ہوا تھا کہ اشفاق کو یہ پتہ لگا کہ ملک رحمت کے گھر میں اُس کی بیوی اکیلی ہے تو وہ اندر چلا گیا۔ میں نے اشفاق سے پوچھا تو اُس نے کہا ایسے ہی ہُوا تھا۔"

"پھر اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اشفاق اچھا خاصا بدمعاش ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "کسی کے گھر میں اس طرح گھس جانا کسی معمولی آدمی کا کام نہیں۔"

"آپ اُس کو بدمعاش نہ سمجھیں" ــــ شبیر نے کہا ــــ "وہ بہت جرأت والا ہے۔ ڈرتا نہیں۔ جو کام کرنا چاہے وہ نہ کرنے والا ہو تو بھی کر ڈالتا ہے۔ ملک رحمت کے گھر میں گھسنے کی ایک اور وجہ تھی۔ اشفاق اس لڑکی مقصودہ کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا جس کو ملک رحمت خرید کر لے گیا۔ اشفاق کی حالت یہ ہو گئی تھی جس طرح اُس کے جسم سے جان نکل گئی ہو۔ یہ تو اُس نے کئی بار کہا تھا کہ میں ملک رحمت کو ایک نہ ایک دن جان سے مار ڈالوں گا۔"

جب اُس نے یہ بات کہی تو وہ چونک کر چُپ ہو گیا اور میرے
مُنہ کی طرف دیکھنے لگا۔ مَیں نے اُس کو کہا کہ وہ کچھ سوچے مت اور بولتا رہے۔

"ہاں جناب!" — اُس نے کہا — "آپ نے ٹھیک محسوس کیا ہے۔
میں یہ بات مُنہ سے نکال کر اِس سوچ میں پڑ گیا ہوں کہ ملک رحمت
قتل ہو گیا ہے اور آپ اشفاق کو شک میں گرفتار کر لیں گے۔"

"شبیر!" — میں نے اُس کو کہا — "تم تھانے میں ایک تھانیدار
کے سامنے بیٹھے ہوئے ہو اور تمہارے والد صاحب باہر تمہاری خاطر پریشان
بیٹھے ہیں۔ اگر کچھ چھپانے کی کوشش کرو گے تو میں تمہیں بھی شک میں گرفتار
کر لوں گا۔ ذرا یہ سوچو کہ میں نے تمہیں کس کے اشارے پر یہاں بلایا ہے۔
ایسے گواہ موجود ہیں جنہوں نے تمہیں اور اشفاق کو اُس جگہ تک جاتے اور
وہاں سے آتے دیکھا ہے جہاں ملک رحمت اللہ کو شکاری بندوق کی
گولی ماری گئی ہے۔ مَیں اِس وقت اِس شک پر بات کر رہا ہوں کہ تم
بھی اس قتل میں شامل تھے۔"

میری اتنی سی بات پر وہ بہت گھبرایا۔ مَیں محسوس کر رہا تھا کہ وہ
کسی سوچ میں پڑ گیا ہے۔ اُس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"نہیں جناب!" — اُس نے کہا — "مَیں اِس قتل میں شامل نہیں
تھا، لیکن وہاں جو کچھ ہوا تھا وہ آپ کو بتا دیتا ہوں۔ یہ تو مجھ کو معلوم نہیں
کہ وہ کون سی اور کیسی جگہ ہے جہاں ملک رحمت کو گولی ماری گئی تھی۔ ہُوا
اس طرح تھا کہ میں تھک گیا تھا اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا تھا۔
اُسی درخت میں سے فاختہ کا ایک جوڑا اُڑا اور پچاس ساٹھ قدم دُور ایک
درخت پر جا بیٹھا۔ اشفاق نے مجھ سے بندوق لے لی اور کہنے لگا کہ تم
آرام کرو، مَیں ان فاختاؤں کو مار لیتا ہوں.....

"وہ چلا گیا۔ مَیں پیٹھ کے بل لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بندوق چلی

میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ دماغ میں لیڈری کا کیڑا ہوتا ہے۔ ان میں بعض
کے ہاتھ میں شہر کے چند ایک غنڈے بدمعاش ہوتے ہیں۔ پولیس کے
ساتھ بھی تعلقات گہرے رکھتے ہیں۔ ایک طرف مذہبی جلسے کراتے ہیں

اور دوسری طرف غنڈہ گردی کرا رہے ہیں۔ ایسے ہی لوگ ایوب خان
کے دور میں بی ڈی ممبر بنے تھے پھر پیپلز پارٹی کے کل پرزے بن گئے اور
اب یہ زکوٰۃ کمیٹیوں کے ممبر یا عہدیدار ہیں۔

خواجہ قدیر ایسا ہی شریف اور باعزت بدمعاش تھا۔ شبیر اُس کا
جوان بیٹا تھا اور اپنے باپ کی لائن پر چل رہا تھا۔ میں نے اُس کو تھانے
بلانا ضروری سمجھا۔ ایک وجہ یہ تھی کہ یہ میرا ملزم ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا
کہ ملک رحمت کو کسی نے قتل کیا ہی نہ ہو اور اس کو اتفاقیہ گولی لگ گئی ہو۔

رات ہو گئی تھی۔ میں تفتیش کے کیچڑ میں پھنسا ہوا تھا۔ میں نے ایک
ہیڈ کانسٹیبل کو کہا کہ وہ خواجہ قدیر کے بیٹے شبیر کو تھانے لے آئے۔
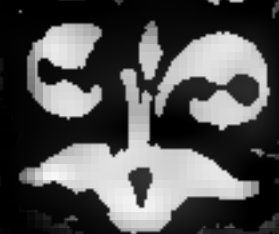
خواجہ قدیر بھی اپنے بیٹے کے ساتھ آ گیا۔ میرے آگے وہ جھک گیا
اور مغلیہ دور کے درباریوں کی طرح سلام کیا۔ اُس نے پوچھا کہ میں نے
اُس کے بیٹے کو کیوں بلایا ہے۔

"خواجہ صاحب!" ــــ میں نے کہا ــــ "آپ کے بیٹے کے خلاف
کوئی الزام نہیں۔ اس سے کچھ پوچھنا ہے.... ملک رحمت اللہ کے قتل کے
سلسلے میں۔ اس کو یہ کہہ دیں کہ اس سے جو کچھ بھی پوچھوں وہ بالکل سچ بتا

کو اسی جگہ نظر آئی۔ میں نے کارتوس چلا دیا۔ جہاں فاختہ بیٹھی ہوئی تھی وہاں
مجھ کو ایک ڈراؤنی سی شکل نظر آئی جس کے دانت باہر نکلے ہوئے تھے۔
پھر اس طرح ہوا کہ میرے سینے پر کسی نے ہاتھ رکھ کر پیچھے کو دھکا دیا۔ میں
سمجھ گیا کہ یہاں جنات کا ڈیرہ ہے۔ میں وہاں سے بھاگ آیا۔ میرے سینے
میں جو ہاتھ پڑا تھا وہ ایسے لگتا ہے جیسے ابھی تک میرے سینے کو دبا
رہا ہے۔ میرا دل سخت ڈرا ہوا اور گھبرایا ہوا ہے۔"

قصبے میں واپس آنے تک اشفاق کی یہی حالت رہی۔ شبیر نے اس
کو بتایا کہ وہ ایک آدمی کے پاس اُس کو لے جائے گا جو آسیبی اثر اتار
دیتا ہے۔ یہ دونوں قصبے میں واپس آ گئے اور اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اس
سے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد سارے قصبے میں یہ خبر پھیل گئی کہ ملک رحمت اللہ

کو کسی نے گولی مار دی ہے۔

"کیا تمہیں اُس وقت یہ شک نہیں ہُوا تھا کہ اشفاق نے ملک رحمت کو گولی ماری ہو گی؟" ـــــ میں نے پوچھا۔

"نہیں" ـــــ اُس نے جواب دیا ـــــ "میرا اُس طرف دھیان گیا ہی نہیں۔ اب آپ نے بات کی ہے تو میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ وہاں کیا ہُوا تھا۔"

مجھ کو آج تک یاد ہے کہ میں جب شبیر کا بیان لے رہا تھا اُس وقت رات کا ایک بج چکا تھا۔ میں نے دو ہیڈ کانسٹیبلوں کو بلا کر کہا کہ اشفاق کو تھانے لے آئیں۔ یہ ایک ہیڈ کانسٹیبل کی ڈیوٹی دی۔ دوسرے کو کہا کہ وہ ملک رحمت کے دونوں بیٹوں اور مقصودہ کو لے آئے۔

میں بہت ہی تھک گیا تھا۔ میں کانسٹیبلوں کی بارک میں جا کر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔ میں نے کانسٹیبلوں کو کہہ دیا تھا کہ دونوں ہیڈ کانسٹیبل واپس آئیں تو مجھ کو جگا لیں۔ مجھ کو جب جگایا گیا تو پتہ لگا کہ میں ایک گھنٹہ سویا ہوں۔ میں نے کہا کہ اشفاق کو میرے دفتر میں بھیج دیں۔ میں نے اُس کو دیکھا تو اُس پر رحم آ گیا۔ صحیح معنوں میں جوانمرد اور خوبرو مرد تھا۔

"اشفاق بھائی!" ـــــ میں نے اُس کو کرسی پر بٹھا کر اُس کی پیٹھ پر تھپکی دی اور کہا ـــــ "ڈرنا اور گھبرانا نہیں۔ یہاں وہ جنات نہیں آ سکتے جنہوں نے تمہیں وہاں دھکا دیا تھا۔ میں تمہارے ساتھ بالکل سیدھی بات کرنا چاہتا ہوں اور ایک سودا بھی کروں گا۔ سچ بولو اور اس کا صلہ مجھ سے لو۔ میں نے اس وقت تمہیں جگایا ہے تو تم سمجھ لو کہ شہادت اکٹھی کر کے اور اپنی پوری تسلی کر کے تمہیں بلایا ہے.... مجھ کو یہ بتا دو کہ تمہارا چلایا ہُوا کارتوس اتفاق سے ملک رحمت اللہ کو لگا تھا یا تم نے انتقام لیا ہے.... کہہ دو کہ تم نے ملک رحمت کو دیکھا ہی نہیں تھا اور تمہاری نظر فاختہ پر تھی۔ وہ تمہیں اُس وقت نظر آیا جب وہ گر

پڑا تھا۔"

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میرے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کی حالت چہرے سے جو نظر آ رہی تھی وہ بہت بُری تھی۔

"بولو اشفاق!" ــــ میں نے اُس کے گال پر ہلکی سی تھپکی دے کر پیار سے کہا ــــ "اس وقت تک مجھ کو اپنا دوست نہیں اپنا بڑا بھائی سمجھو۔ یہ تھوڑا سا وقت ہے۔ یہ گزر گیا تو بہت پچھتاؤ گے۔ تمہارے واسطے اس جال سے نکلنے کا کوئی ذریعہ اور کوئی راستہ نہیں۔"

یہ جوان آدمی تھا تو بہت دلیر لیکن انسان کا قتل دلیری ختم کر دیتا ہے۔ اُس نے جذبات میں آ کر ایک انسان کو قتل کر دیا تھا لیکن اس کے بعد اُس کی جو حالت ہوئی وہ آپ شبیر کی زبانی پڑھ چکے ہیں اور اب وہ گہری نیند سے اُٹھ کر آیا تھا اور میں نے اچانک اُس کے سامنے اُس کا جرم رکھ دیا تھا۔ یہ ایک نفسیاتی جال ہوتا ہے جس سے نکلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اشفاق کی خاموشی بتا رہی تھی کہ قاتل یہی ہے۔ میں نے اپنا پیار اور شفقت والا رویّہ برقرار رکھا جس کے نتیجے میں وہ بول پڑا۔

"مجھ کو ایک بات بتائیں" ــــ اُس نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا ــــ "اگر میں یہ کہوں کہ میرے چلائے ہوئے کارتوس کے چھرے اتفاقیہ ملک رحمت کو لگ گئے تھے تو کیا ہو گا؟"

"جو ہو گا وہ مجھ پر چھوڑ دو" ــــ میں نے کہا ــــ "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔"

اُس نے بڑا گہرا اور لمبا سانس لیا اور کہنے لگا ــــ "میں نے خود اُس کو گولی ماری ہے۔"

"کیا تم یہ ارادہ لے کر گئے تھے کہ ملک رحمت وہاں کھڑا ہو گا اور تم اُس کو گولی مارو گے؟" ــــ میں نے پوچھا۔

"نہیں" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "اس شخص کو قتل کرنے کا ارادہ تو ہر وقت میرے دل میں رہتا تھا لیکن کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

مجھ کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ بدکار انسان وہاں ہے۔ ہم پرندے مارتے رہے۔ شبیر تھک کر لیٹ گیا۔ مجھ کو فاختہ کا ایک جوڑا درخت پر بیٹھا نظر آیا۔ میں نے شبیر کی بندوق اُٹھائی اور ان فاختاؤں کے پیچھے چلا گیا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ آگے جگہ گہری ہے اور میں اُس کے اونچے کنارے پر کھڑا ہوں۔ میں نے نیچے دیکھا۔ ملک رحمت میری طرف پیٹھ کر کے آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ فاصلہ کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ نیچے تھا۔ میں اوپر تھا۔ نیچے والے درختوں کی شاخیں اُوپر تک آئی ہوئی تھیں۔ اچانک میرے سینے میں آگ بھڑکی اور مجھ کو یاد آ گیا کہ اس شخص نے اُس لڑکی کو اپنی زرخرید لونڈی بنا لیا ہے جس کو میں چاہتا تھا اور جو مجھ کو پسند کرتی تھی۔ پھر اس شخص نے مجھ کو بہت بُری طرح پٹوایا تھا اور میرے باپ کی بھی بے عزتی کی تھی۔ بس جناب! مجھ پر تو جیسے کوئی دَورہ پڑ گیا تھا۔ میں نے اُس کے سَر کے پیچھے نشانہ باندھا اور انگلی دبا دی۔ وہ رُکا پھر گر پڑا۔"

"کیا مقصودہ واقعی تمہیں چاہتی تھی؟"

"جی ہاں" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "لیکن یہ ملاقاتوں والی محبت نہیں تھی۔ میں اتنا جانتا تھا کہ اُس کے دل میں میری چاہت ہے اور میرے دل میں اُس کی جو محبت ہے وہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔"

"اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دو سال پہلے تم مقصودہ کی مرضی سے اُس کے گھر گئے تھے" ــــ میں نے کہا ــــ "اور تمہاری توقع کے خلاف ملک رحمت کا بڑا بیٹا آ گیا۔"

"نہیں" ــــ اُس نے جواب دیا ــــ "میں خود گیا تھا... اب بتائیں آپ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

"میرا سلوک اچھا ہی ہوگا" ــــ میں نے کہا ــــ "تم مجسٹریٹ کے پاس صحیح اقبالی بیان دے دینا۔ بچنے کا راستہ میں بتاؤں گا۔"

اقبالی بیان تو وہ دے ہی چکا تھا۔ مجسٹریٹ کو بیان دینے پر بھی وہ راضی ہو گیا لیکن میرے واسطے مکمل شہادت کی فراہمی ضروری تھی۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ تمام مشتبہ افراد کو چھٹی دے دی۔ تھانے میں

مقصودہ اور ملک رحمت کے دونوں بیٹے اور شبیر رہ گئے۔ مقصودہ کا بیان لینا ضروری تھا۔ قتل کا باعث ثابت کرنے کے واسطے مقدمے میں یہ شامل کرنا ضروری تھا کہ اشفاق اور مقصودہ کی آپس میں محبّت تھی۔ مَیں نے مقصودہ کو اندر بلایا اور اشفاق کو باہر لے جا کر حوالات میں بند کر دیا۔

"مقصودہ!" ___ مَیں نے کہا ___ "اشفاق نے ملک رحمت کے قتل کا اقبال کر لیا ہے۔"

مقصودہ کی آنکھیں ٹھہر گئیں اور میرے چہرے پر جمی رہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

"آپ اس کو کیا سزا دلائیں گے؟" ___ اُس نے سسکتے ہُوئے پوچھا۔

"نہیں مقصودہ!" ___ مَیں نے جھوٹ بولا ___ "مَیں اُس کو بچانے کی کوشش کروں گا۔ موقعہ کا کوئی گواہ نہیں۔"

"اگر آپ نے اُس کو بچا لیا تو ساری عمر آپ کو دعائیں دیتی رہوں گی" ___ اُس نے کہا ___ "مَیں بڑی دُکھی عورت ہوں جناب! اشفاق نے جو کچھ کیا ہے وہ میری خاطر کیا ہے۔"

"کیا تمہیں معلوم تھا کہ وہ ملک رحمت کو قتل کرے گا؟" ___ مَیں نے پوچھا۔

"ہاں مجھے معلوم تھا" ___ اُس نے جواب دیا ___ "لیکن اب پچھتا رہی ہوں" ___ اتنا کہہ کر وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ کچھ دیر بعد اُس نے کہا۔ ___ "تھانیدار صاحب! آپ نہیں جانتے میں کتنی دُکھی ہُوں۔ اس شخص نے جو روپے پیسے کے زور پر میرا خاوند بن گیا تھا، مجھ کو کس جہنّم میں ڈالے رکھا ہے۔ نوکروں کی گھر میں کچھ عزت ہوتی ہے۔ میری وہ بھی نہیں تھی۔ مجھ کو قیمتی کپڑے اور زیورات صرف اس وجہ سے پہنائے رکھتا تھا کہ میں اس کو خوبصورت دلہن کی طرح نظر آتی رہوں۔ اُس کو میری بددعاؤں نے کُتّے کی موت مارا ہے لیکن ظلم یہ ہُوا ہے کہ میرا اپنا جگر سُولی پر چڑھ گیا ہے۔"

اُس پر جذبات کا شدید غلبہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے آپ میں نہیں رہی

تھی۔ رو رہی تھی اور اُس کے منہ میں جو آتا تھا کہتی جا رہی تھیں۔ یقین جانیں کہ ایک بار تو میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے، لیکن میں اُس پر صرف زبانی کلامی رحم کر سکتا تھا۔ میں اشفاق کو سزا سے دیدہ دانستہ نہیں بچا سکتا تھا۔

"مقصودہ!" — وہ جب ذرا سنبھلی تو میں نے اُس کو کہا — "اشفاق نے ملک رحمت کو اس وجہ سے قتل کیا ہے کہ اُس نے اشفاق کو بہت پٹوایا تھا اور اُس کے باپ کی بھی بہت بے عزتی کی تھی۔ یہ اشفاق کی غلطی تھی کہ وہ تمہیں اکیلا دیکھ کر تمہارے گھر میں داخل ہو گیا تھا۔"

"کیا آپ کو اُس نے یہ بتایا ہے؟"

"ہاں" — میں نے کہا — "اُس نے یہی بیان دیا ہے کہ وہ زبردستی تمہارے گھر میں داخل ہوا تھا۔"

وہ مکمل طور پر جذبات کے قابو میں تھی، اس وجہ سے اُس کی زبان بے قابو ہو گئی تھی۔

"اگر میں آپ کو راز کی ایک بات بتاؤں تو کیا آپ اشفاق کی کچھ مدد کریں گے؟" — اُس نے کہا — "آپ دیکھیں کہ اُس میں قربانی کا جذبہ کتنا زیادہ ہے.... راز کی بات یہ ہے کہ اشفاق کو میں نے خود اپنے گھر بلایا تھا۔"

"اور خود ہی پکڑوا دیا" — میں نے کہا — "اور اُس کی پٹائی کرا دی.... یہ کیا ڈرامہ تھا؟"

"مجھ کو اشفاق اچھا لگتا تھا" — اُس نے کہا — "یہ تو مجھ کو بعد میں پتہ لگا تھا کہ وہ مجھ کو اتنا زیادہ چاہتا ہے۔ میری شادی ملک رحمت کے ساتھ کر دی گئی تو اشفاق کے ساتھ ملاقات ہو گئی۔ تب مجھ کو پتہ لگا کہ اُس کے دل میں میری کتنی زیادہ محبت ہے۔" اُس کے آنسو نکل آئے تھے۔

مقصودہ کی یہ کہانی بہت لمبی ہے۔ میں اپنے لفظوں میں سنانا بہتر سمجھتا ہوں۔ ملک رحمت اللہ کی بیوی [illegible] کے جذبات کچلے گئے اور ظلم یہ ہوا کہ ملک رحمت اللہ نے اُس کے ساتھ بہت بُرا سلوک

شروع کر دیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مقصودہ کے دل میں اشفاق کی محبت اور زیادہ گہری ہو گئی۔ وہ جب اپنے ماں باپ کے گھر جاتی تھی تو اشفاق سے ضرور ملتی تھی لیکن ان کی محبت میں پاکیزگی تھی۔

ایک سال گزر گیا۔ ایک روز مقصودہ اپنے دروازے میں کھڑی تھی۔ اشفاق اُدھر سے گزرا۔ اُس نے اشفاق کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اشفاق اندر چلا گیا۔ مقصودہ نے اُس کو بتایا کہ وہ گھر میں اکیلی ہے۔ وہ اشفاق کو خود اندر لے گئی۔ اُس نے باہر والے دروازے کو اندر سے بند کر دیا تھا۔ وہ اشفاق کو کمرے میں لے گئی اور پیار و محبت کی باتیں ہونے لگیں۔

یہ میں آپ کو سنا چکا ہوں کہ ملک رحمت اللہ کا بڑا بیٹا کس طرح اندر آگیا تھا۔ مقصودہ پر ایسا خوف طاری ہوا کہ وہ کچھ سوچنے کے قابل نہ رہی۔ اُس کو ایک خیال یہ آیا کہ ملک رحمت اُس کو جان سے مار ڈالے گا